اسلامیانِ پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کا ایک عظیم مجاہد
ڈاکٹر عبدالغنی (جلالپوری)
(۱۸۶۴ تا ۱۹۴۳)
بی اے - ایم بی - آر سی پی - ایم آر ایس لندن
سابق ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن افغانستان، سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور
سابق چیف میڈیکل آفیسر کابل، سابق انگلش پرائیویٹ سیکرٹری برائے
امیر عبدالرحمٰن و امیر حبیب اللہ والیانِ افغانستان،
سابق رکن مجلسِ قانون افغانستان و رکن
مجلسِ مشاورت برائے امان اللہ
سابق چیف دارالترجمہ والتالیف کابل
عبدالقدیر نجفی
ایم اے، ایم ایڈ
مکتبہ معارفِ نجف
عقب پیکو آرٹ پریس
ملتان روڈ لاہور

اسلامیانِ پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کا ایک عظیم مجاہد

ڈاکٹر عبدالغنی (جلالپوری)

(۱۸۶۴ تا ۱۹۴۳)

بی اے - ایم بی - آر سی پی - ایم آر ایس لندن

سابق ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن افغانستان، سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور
سابق چیف میڈیکل آفیسر کابل، سابق انگلش پرائیویٹ سیکرٹری برائے
امیر عبدالرحمن و امیر حبیب اللہ والیان افغانستان،
سابق رکن مجلس قانون افغانستان و رکن
مجلس مشاورت برائے امان اللہ
سابق چیف دارالترجمہ
والتالیف
کابل

عبدالقدیر نجفی ایم اے، ایم ایڈ

مکتبہ معارفِ نجف
عقب پیکو آرٹ پریس
ملتان روڈ لاہور

قیمت /۵۰ روپے

ڈاکٹر محمد عبد الغنیؒ جلالپوری

سابق ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، افغانستان۔ سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور۔
چیف میڈیکل آفیسر، کابل۔ پرائیویٹ انگلش سیکرٹری امیر عبدالرحمٰن خان
و امیر حبیب اللہ خان۔ ممبر اوف کونسل آف امیر امان اللہ خان۔ ممبر
لیجلیٹو کونسل افغانستان

فہرست عنوانات ابواب

حرفِ آغاز

اپنے وطن عزیز میں کچھ مافات شخصیتیں ایسی گذری ہیں جو بہت عظیم ہوتے ہوئے بھی زمانے کی ستم ظریفی سے غیر معروف ہیں ان میں سے دو شخصیتیں جلالپور جٹاں ضلع گجرات کے مولانا نجف علی عاصی (۱۸۶۰ء - ۱۹۵۰ء) اور ان کے برادرِ اصغر ڈاکٹر محمد عبد الغنی (۱۸۶۴ء - ۱۹۴۳ء) ہیں۔ اوّل الذکر ہستی کے خفتہ نام کو بیدار کرنے کی کوشش کے طور پر تقریباً دو دہائیاں پیشتر عبد الجلیل نجفی نے ایک تنقیدی مقالہ بعنوان "احوال و آثارِ مولانا نجف علی عاصی جلالپوری" لکھا تھا جو نومبر ۱۹۸۵ء میں اشاعت پا سکا۔ اس میں بعد الذکر ہستی کا بھی تھوڑا بہت تذکرہ موجود ہے۔ ۱۹۸۶ء کی ابتدا میں مجھ راقم الحروف کو خیال آیا کہ ڈاکٹر محمد عبد الغنی مرحوم کی حیات اور ان کے کارناموں پر ایک تحقیقی کتاب تحریر کروں جس میں مولانا نجف علی مرحوم کی بابت بھی کچھ مواد شامل ہو اور اس طرح ان دونوں بزرگوں کے کارہائے نمایاں پر سے گمنامی کا پردہ ہٹانے کی کچھ چارہ جوئی کی جا سکے۔ چونکہ یہ تصنیف ڈاکٹر صاحب کے موضوع پر ہے اس لئے ان کے متعلق قارئینِ کرام کو یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ خدمات افغانستان میں انجام دیں اور اس ملک میں ان کا عروج زیادہ عرصے تک رہا اور برصغیر پاک و ہند میں ان کے اقتدار کا دور بحیثیت پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور صرف تین سال (۱۸۹۳ء - ۱۸۹۶ء) رہا لہٰذا وہ افغانستان میں مقابلتاً ذرا زیادہ مشہور ہوئے گو آجکل وہاں بھی شاید کم لوگ ہی انہیں جانتے ہیں۔ برصغیر میں جو اصحاب ان سے واقف تھے وہ بتدریج دنیا سے اٹھتے چلے گئے اور اب یہاں بھی شاذ و نادر ہی کوئی شخص ان کے نام اور کام سے باخبر ہے۔

یہ امر بھی ناظرین کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں

افغان مہاجرین کی آمد سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان میں کچھ نئی فارسی کتب دستیاب ہوئیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں ۔۔۔ مثلاً "جنبش مشروطیت در افغانستان" از عبدالحئی حبیبی اور "افغانستان در مسیر تاریخ" از میر غلام محمد غبار ہیں ۔۔۔ عاصی برادران پر بہت سی وہ قیمتی معلومات بھی ہیں، جو ان کتب کی آمد سے پہلے ہماری دانست میں نہیں تھیں یہی سبب ہے کہ جب کتابچہ "احوال و آثار مولانا نجف علی عاصی" لکھا گیا تھا تو اسمیں فقط اس مواد سے استفادہ کیا جا سکا تھا جو ہمارے پاس موجود تھا۔ عزیز ہندی کی کتاب "زوال غازی امان اللہ" بھی بعد میں دستیاب ہوئی۔ علامہ حاجی محمد اسد کا مکتوب بھی بعد میں ملا، پیسہ اخبار کی خبریں بھی بعد میں ہاتھ آئیں، یہی یہ تمام باتیں کتاب ہذا کی تخلیق کے لئے محرک بنیں۔ چونکہ یہ ایک تحقیقی تصنیف ہے اس لئے بیانات کی توثیق کے لئے جا بجا حوالہ جات دیئے گئے ہیں جن سے کتاب کے مندرجات زیادہ مستند ہو گئے ہیں اور ان متنوع بیانات سے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں دوسرے فضلا کے تاثرات بھی منصۂ شہود پر آ گئے ہیں۔

یہ بڑی حیرت کی بات ہے اور اس سے بہت قلق ہوتا ہے کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب جیسی قد آور شخصیت کو جنہوں نے نہ صرف افغانستان اور برصغیر ہندوستان کی تعلیمی ترقی اور حصول آزادی کے لئے گراں قدر خدمت انجام دی بلکہ افغانستان میں جمہوریت کو متعارف کرنے کے لئے عرق ریز جد و جہد کی اتنی جلدی اور پوری طرح بھلا دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ورطۂ حیرت میں لانے کی ایک اور غرض یہ ہے کہ مسلم نژاد نو ڈاکٹر صاحب جیسے دردمند اور مخلص انسان کی ان قربانیوں سے روشناس ہو سکے جو انہوں نے امت مسلمہ کی تقویت کے لئے وقتاً فوقتاً پیش کیں۔

پاکستان کے مختلف اداروں یا اختیاروں کی جانب سے کہا جاتا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے حضرات کے اسماء اور ان کی کاوشوں کی نشان دہی کرے جنہوں نے تحریک آزادی کے میدان میں یا کسی اور شعبۂ حیات میں کوئی قابل فخر کام انجام دیا ہو تو ایسی نشان دہی کو گوہر گم گشتہ سمجھ کر اسکی پذیرائی کی جائیگی اور ان اسماء اور ان کی

کارکردگی کوا جاگر کرنے کا بندوبست کیا جائیگا۔ لیکن جب ہم نے متعدد بار مطلوبہ نشاندہی کی تو نتیجتاً ہم نے ہر بار جانے کوان جانا اور سنے کو ان سنا پایا۔

یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ برصغیر کی آزادی بہت طویل اور صبر آزما مساعی کے بعد حاصل ہوسکی۔ ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک منزل آزادی کو جانے والے سنگلاخ راستے پر مختلف رہنماؤں مثلاً شاہ اسماعیل شہید، سید احمد شہید، سرسید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر محمد عبدالغنی، ڈاکٹر محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے اس فصیل کو اپنی اپنی بساط کے مطابق دھکا دیکر گرانے کی کوششیں کی جو منزلِ آزادی تک پہنچنے میں حائل تھی۔ مختلف وقتوں میں اس فصیل کو جو دھکے لگتے رہے وہ بظاہر ناکام گئے مگر ان تمام دھکوں اور جھٹکوں سے وہ فصیل بتدریج متزلزل ہوتی چلی گئی اور آخر قائداعظم اور ان کے رفقائے کار کے آخری جھٹکے پر وہ دھڑام سے نیچے آرہی۔ آزادی کی جہدِ مسلسل کو اس کنویں سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے جسکے خشتی فرش پر پانی بھرنے کے لئے گھڑے بار بار ایک ہی جگہ رکھنے سے قوس نما گڑھے بن جاتے ہیں۔

آخر میں میں یہ انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ تحریک آزادی کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب مغفور کی معرکۃ الآرا انگریزی تصنیف "اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچوئیشن اِن سینٹرل ایشیا" میں برطانوی حکومت اور اہل ہند کے اختلافات، برطانیہ اور روس کے تنازعات، روس اور افغانستان کے تعلقات اور اہل ہندوستان و اہل افغانستان کے باہمی معاملات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے، نیز اس میں مسلم زعمائے ہند کو حصول آزادی کے حوالے سے بہت سے مفید مشورے دیئے گئے ہیں اور برطانوی ہند کی حکومت کو مثبت پالیسیاں اپنانے کے لئے قیمتی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ وسطِ ایشیا کے سیاسی مسائل اور حالات پر محیط اس گراں بہا تصنیف میں سے چند اہم اقتباسات کا اردو ترجمہ شامل کتاب ہذا کر دیا گیا ہے، تاکہ قارئین آزادی کے موضوع پر قبلہ

ڈاکٹر صاحب کے خیالات اور آراء سے مطلع ہو سکیں۔

احقر العباد

عبد القدیر نجفی

(سابق پرنسپل)

مصطفیٰ کوارٹرز۔ جنڈر سٹریٹ

نوتھیہ۔ پشاور صدر۔

۲۷ جنوری ۱۹۸۹ء

(جمعۃ المبارک، ۱۸۔ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ)

منجانب جناب عزیز جاوید، تمغۂ امتیاز

ڈاکٹر عبدالغنی صاحب جلالپوری کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ کتاب کئی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے قارئین کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حالات زندگی کے علاوہ ان کی گوناگوں خدمات کا اچھا خاصا علم ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے سے وسط ایشیا کے ممالک ــــ روس، افغانستان اور پاکستان کے ایک دوسرے سے وابستہ سیاسی مسائل سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف "اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچوئیشن ان سینٹرل ایشیا" کے مشمولات اور ان کی سیاسی و تعلیمی سرگرمیوں کا تعلق وسط ایشیا کے کم و بیش ان تینوں ملکوں اور ترکی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

مدتِ دراز سے افغانستان اور برصغیر پاک و ہند ایک دوسرے کے بڑے ہمدرد اور مددگار رہے ہیں۔ افغانستان نے برصغیر کی وقتاً فوقتاً جو غمخواریاں اور امدادیں کیں۔ ان میں سے سید جمال الدین افغانی اور امیر امان اللہ خان غازی کی ملی ہمدردیوں اور اعانتوں کو بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔ سید جمال الدین نے امت مسلمہ کو بیدار اور متحد کرنے کے لئے جو عظیم خدمات انجام دیں ظاہر ہے کہ برصغیر کے مسلمان بھی ان خدمات سے متمتع ہوئے۔ اسی طرح امیر امان اللہ خان نے حصولِ آزادی کے سلسلے میں مسلمانانِ ہند کی بیحد حوصلہ افزائی کی۔ اُس سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہند اُسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ ایسے اکابرین کی قولی و عملی خدمات کے جواب میں برصغیر کے مونس علماء و فضلاء مثلاً ڈاکٹر عبدالغنی، مولانا نجف علی، مولانا عبیداللہ سندھی، حاجی ترنگزئی اور مولوی برکت اللہ نے بھی کئی لحاظ سے افغانستان کی فلاح و تقویت کے لئے کام کیا۔ ماضی سے لیکر اب تک ارض پاک کی حکومت اور عوام اپنے افغان بھائیوں کی دستگیری

کرتے چلے آئے ہیں۔ جب سے روس نے افغانستان میں بے جا مداخلت کی ہے، اور اس کے نتیجے میں افغانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا ہے پاکستان نے اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف ان مہاجر بھائیوں کو پناہ دی اور ان کی خاطر معاشی زیر باری برداشت کی بلکہ افغانستان کی کٹ پتلی انتظامیہ کی طرف سے آئے دن ہونے والے دھماکوں اور بمباری کا زبردست نقصان سہا۔

کتاب ہٰذا کے مطالعے سے قارئین بخوبی جان سکتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالغنی مغفور نے اپنے حین حیات متعدد کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ انگلستان میں انہوں نے خلافتِ ترکیہ کے بارے میں حکومت برطانیہ کے مخاصمانہ رویے پر کڑی تنقید کی۔ افغانستان میں انہوں نے تعلیم عمومی کی افزائش کی اور تصور جمہوریت کی آبیاری کی اور برصغیر ہندوستان میں انہوں نے اسلامی نظریات کے مطابق مسلم نژادِ نو کی تعلیم و تربیت کی اور اپنی تصنیف 'اے ریویو' کے ذریعے انہوں نے حصولِ آزادی برصغیر کے لئے بہت کارآمد تدابیر سجھائیں۔ زندگی بھر وہ قوم کے روحانی امراض کے علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی امراض کا علاج بھی کرتے رہے ہمیں ڈاکٹر صاحب جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں سے ملنے والی رہنمائی کو حرزِ جان بنانا چاہیئے اور ان کے بتلائے ہوئے نسخوں پر عمل کرکے شفائے کامل پانی چاہیئے۔

یہ امر باعثِ رنج ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں ڈاکٹر عبدالغنی اور ان کے برادر بزرگ مولانا نجف علی کے نام اور کام گہنا چکے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں ایک تو یہ حضرات خود نام و نمود کے حریص نہ تھے، دوئم انہوں نے زیادہ عرصہ افغانستان میں گذارا اور اس میں سے بھی ان کا بیشتر وقت قید و بند میں کٹا مگر جائیدادوں کی ضبطی سے اور طویل قید و بند کی صعوبتوں سے ان کے عزم اور پامردی میں کوئی کمی نہ آئی۔ انہوں نے بندی خانے میں بھی اور بعد میں بھی تصنیف و تالیف کے اپنے تعمیری شغل اور یادِ خدا کی معروفیت کو جاری رکھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تصنیف "اے ریویو" کی ایک نظم ایلیجی (نوحہ) میں دارو غہ جیل کی اس طنزیہ ہنسی کا ذکر

کرتے ہیں جو اسے ان کی حالتِ زار کو دیکھ کر آئی ۔اس بے بصر کو کیا معلوم کہ روزِ ازل سے جابر اور بے شعور حکمرانوں کے ہاتھوں بہت سی باعظمت اور بے قصور ہستیاں قید و بند کے دکھ جھیلتی چلی آئی ہیں ۔ڈاکٹر صاحب اسی نظم میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں مجھے جب یہ ۔۔۔۔ خیال آتا ہے کہ اس نہ ختم ہونیوالی قید کی وجہ سے میں اپنے گذرے ماضی کی طرح شاید مستقبل میں بھی کوئی ارفع کارکردگی نہیں دکھا سکوں گا تو میں نہایت ملول ہوجاتا ہوں ؛ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے ذکر سے ایک صاحب کا یہ جملہ یاد آیا کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے سیاست تو کی مگر کوئی تصنیفی کام نہیں کیا اور بالخصوص انہوں نے اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ؛ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے ۔ڈاکٹر عبدالغنی اور ملا نا نجف علی جیسی شخصیتوں نے اپنے متعلق بھی اور دوسروں کے متعلق بھی کچھ لکھا ہے ۔

ایک مدت سے عبدالقدیر صاحب نجفی نے یہ ذمہ لیا ہے کہ وہ یہ کتاب تحریر کر کے اپنے ان بزرگوں کے کارناموں پر سے تاریکی کے پردے ہٹانے کی کوشش کریں ۔انہوں نے بڑی محنت اور چھان بین سے یہ کتاب لکھی ہے اس سے قبل ان کے چھوٹے بھائی عبدالجلیل صاحب نجفی نے ایک تنقیدی مقالہ "احوال و آثار مولانا نجف علی خان خاصی جلالپوری" لکھ کر اس سمت میں ایک گراں قدر پیش رفت دکھائی ہے ۔میں عبدالقدیر صاحب کو بھی طویل عرصے سے جانتا ہوں اور ان کے ان بزرگوں کے بارے میں بھی کچھ واقفیت رکھتا ہوں ۔عبدالقدیر صاحب نے پہلے انگریزی میں اس موضوع پر کتاب لکھنی شروع کی تھی ۔ان کا مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت بیرون ملک بھی متعارف ہوسکے ،لیکن میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس موضوع پر پہلے وہ اردو میں ایک کتاب لکھیں تاکہ پہلے پاکستان میں تو اُن کے نام اور کام کی شناخت ہوسکے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں بھائیوں نے اپنے ان اجداد کی زندگیوں کے کچھ گوشوں کو بہت اچھی طرح سے بے نقاب کیا ہے مگر ابھی بہت سا تحقیقی کام کرنا باقی ہے ۔دیگر اصحاب علم و دانش سے بھی استدعا ہے ۔کہ وہ آگے

آئیں اور اس کارِ خیر میں حصہ لیں اور اس موضوع پر مزید تحقیقاتی کام انجام دیں۔

عزیز جاوید (تمغۂ امتیاز)
سیکرٹری اباسین آرٹس کونسل پشاور

۲۰ فروری ۱۹۸۹ء

باب اوّل

ابتدائی حالاتِ زندگی

(۱) خاندان و پیدائش جلالپور جٹاں[1] ضلع گجرات پنجاب میں مولوی عبد الصمد (المعروف بہ دسوندی خان[2] یا اللہ لوک) کا ایک دینی و علمی گھرانا تھا۔ مولوی عبد الصمد مرحوم و مغفور کا ذریعۂ آمدن کھیتی باڑی تھا۔ ان کے کھیت پنڈی میانی کے نزدیک موضع لمبھوڑ ضلع گجرات میں واقع تھے۔ دریائے چناب کے رخ کی تبدیلی کی وجہ سے یہ تمام زمین آب بُرد ہو گئی اب جبکہ کوئی دیگر ذریعۂ آمدن نہ تھا مولوی صاحب موصوف مجبوراً پنڈی میانی کو چھوڑ کر جلالپور جٹاں میں

---

[1] قصبہ جلالپور جٹاں کے بارے میں محمد صدیق طالب کے چند اشعار بہ عنوان 'جلالپور جٹاں تاریخ کے آئینے میں' ملاحظہ ہوں:-

وہ حیدر اللہ خان ہو یا مولوی نجف
بکھرے پڑے ہیں علم کے موتی ہر اک طرف
سیّد حبیب تیری سیاست میں سر بکف
ہے خضر خان و قاضیٔ حق سے تیرا ظہور
ارضِ جلالپور اے ارضِ جلالپور
سوئے ہیں تیری خاک تلے شارحِ صدور

[2] 'WHO'S WHO IN AFGHANISTAN' صفحہ ۱۷ مارچ ۱۹۳۰ء و منسلک شجرۂ نسب

آ بسے اور ایک اسکول میں فارسی کے مدرّس کے طور پر کام کرنے لگے۔ مولوی صاحب کو فارسی کے علاوہ عربی پر بھی بہت عبور حاصل تھا۔ لوگ ان کے علم و فضل اور دینداری کے سبب سے ان کی بہت تکریم کرتے تھے۔[1] ان کے چار بیٹے تھے۔ نجف علی، محمد عبدالغنی، غلام حیدر اور محمد چراغ۔

محمد عبدالغنی ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بڑے بھائی نجف علی سے چار سال چھوٹے تھے۔[2] ڈاکٹر عبدالغنی مرحوم کے آبا و اجداد کا تعلق جنجوعہ راجپوت[3] غیر مسلم قوم سے تھا۔ ان کے اجداد میں سے ایک شخص شیخ راؤ جیسا کہ شائلِ کتاب شجرۂ نسب سے ظاہر ہے مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح علامہ اقبال نے اپنے اجداد کی بابت بتایا ہے کہ وہ غیر مسلم برہمن تھے جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمے بینی
برہمن زادہ اے رمز آشنائے روم و تبریز است — اقبالؒ

---

[1] احوال و آثارِ مولانا نجف علی عاصی جلالپوری، صفحہ ۱۲ از عبدالجلیل نجفی
[2] تاریخ اور مہینہ معلوم نہیں۔ مولوی محمد چراغ صاحب مرحوم کے بیان کے مطابق بس اتنا پتہ ہے کہ ان کی ولادت ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ اور وفات ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔

[3] ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کے خاندان کے افراد جنجوعہ ہونے کی بناء پر اپنے نام کے ساتھ راجہ یا رانا لکھتے ہیں مثلاً راجہ محمد عبداللہ، رانا عبدالرشید۔ صرف مولانا نجف علی خان مرحوم کی اولاد ایک عرصے سے لفظ نجف کی نسبت سے اپنے آپ کو نجفی کہلا رہی ہے۔ مثلاً راقم الحروف اور میرے دوسرے بھائی جو مولانا نجف علی خان صاحب کے پوتے ہیں اپنے والد ماجد حافظ عبدالمجید صاحب مرحوم کی ہدایت پر ایک مدت سے اپنے نام کے ساتھ لفظ نجفی منسلک کیے ہوئے ہیں ورنہ پہلے میں بھی اپنے آپ کو عبدالقدیر جنجوعہ لکھتا تھا۔

(٢) تعلیم

ابتدائی تعلیم

ڈاکٹر عبدالغنی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبہ جلالپور جٹاں میں ہی پائی۔ میٹرک مشن ہائی سکول گجرات سے[1] امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور

(صفحہ ۱۴ سے پیوستہ حاشیہ)

راجہ محمد عبداللہ مرحوم ڈاکٹر صاحب کے بھانجے تھے۔ یہ پہلے ملٹری کالج ڈیرہ دون (یو۔ پی) اور پھر ملٹری کالج سرائے عالمگیر (جہلم) میں پروفیسر اور پرنسپل رہے۔ یہ آئی، آئی چندریگر مرحوم (سابق وزیراعظم پاکستان) کے سمدھی تھے۔ انہوں نے اسلامی موضوعات پر اشعار کے علاوہ نثر میں دو کتابیں اسلامیات اور Divine Truths of Islam (for Pakistani men of action) لکھیں۔

رانا عبدالرشید جنہوں نے مذکورہ شجرۂ نسب مہیا کیا، راجہ محمد عبداللہ کے بڑے بھائی مولوی عبدالرحمان مرحوم کے پوتے ہیں۔

[1] حافظ عبدالمجید صاحب مرحوم کے کہنے کے مطابق یہ دونوں بھائی (مولانا نجف علی اور ڈاکٹر عبدالغنی) جلالپور سے جہاں اُن دنوں صرف پرائمری کی سطح تک سکول تھا۔ پرائمری کا امتحان پاس کر کے گجرات کے مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں جلالپور گجرات والی سڑک کچی تھی۔ آج کل تو اس سڑک پر بسیں بھی چلتی ہیں، مگر کبھی تانگے بھی بہت کم دیکھنے میں آتے تھے۔ یہ دونوں بھائی اتوار کی چھٹی گھر جلالپور میں گزار کر پچھلے پہر عموماً پیدل کم و بیش آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے گجرات پہنچتے اور ایک ہفتے تک یعنی ہفتے کے روز تک وہیں اپنی ایک پھوپھی صاحبہ کے ہاں ٹھہرتے۔ ایک ہفتے کا خرچ یہ اپنے ہمراہ لے جاتے۔ راستے میں ایک گاؤں بیو والی میں بیری کے بہت سے درخت ہوا کرتے تھے جن پر بہت زیادہ پھل لگتا تھا۔ یہ بھائی عام طور پر اُن بیریوں کے کچھ بیر بھی ہمراہ لے لیتے۔ یہ بھائی ابھی چھٹی جماعت میں تھے کہ ایک روز اُن کی پھوپھی

(باقی اگلے صفحے پر)

اپنے بڑے بھائی مولانا نجف علی خان کی طرح ۱۸۸۳ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی۔[1]

عبدالحی حبیبی نے میر قاسم کی بات پر بھروسہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی علی گڑھ کالج کے گریجویٹ تھے[2] یہ بات صحیح نہیں ہے۔ پروفیسر مولوی محمد حسین جالندھری جو کابل میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ قید رہے بی اے علیگ تھے، چونکہ ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر صاحب دونوں اکٹھے قید رہے اور دونوں پنجاب کے تھے لہٰذا ممکن ہے کہ حبیبی اور میر قاسم کو یہ مغالطہ ہوا ہو کہ پروفیسر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی علی گڑھ میں پڑھتے رہے تھے۔

اعلیٰ تعلیم

ڈاکٹر صاحب حکومتِ برطانیہ کی طرف سے وظیفہ دیا گیا پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں وہ اپنی طالب علمی کے دوران خلافتِ ترکیہ کی حمایت میں طلبہ کی تنظیم میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اور دارالعوام (HOUSE OF COMMONS) میں بحیثیتِ مُبصّر انگریزوں کے خلاف فصیحانہ و بلیغانہ تقریریں کرتے رہے۔ ان کی ایسی تقاریر انڈین پریس سے بھی چھپتی رہیں، اُن دنوں گلیڈسٹون انگلستان کا وزیراعظم تھا، وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی ان انگریزی تقاریر کی فصاحت اور مسکت دلائل کو تسلیم کرتا تھا۔ ان کے ملکۂ گویائی کے متعلق اس کتاب میں کسی اور مقام پر ایک الگ عنوان قائم کیا جائیگا۔ یہاں ہم ان کی پُرجوش تقاریر کے بارے میں مولانا نجف علی خان عاصی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

صاحب نے اُن کو کہا۔ اگر تم نے میرے پاس رہنا ہے تو پنج وقت نماز باقاعدگی سے ادا کرنا ہوگی۔ اس دن سے زندگی کے آخری ایام تک ان بھائیوں نے نماز کبھی نہیں چھوڑی۔

[1] بیان مولوی محمد چراغ صاحب
[2] جنبش مشروطیت در افغانستان، صفحہ ۶۳
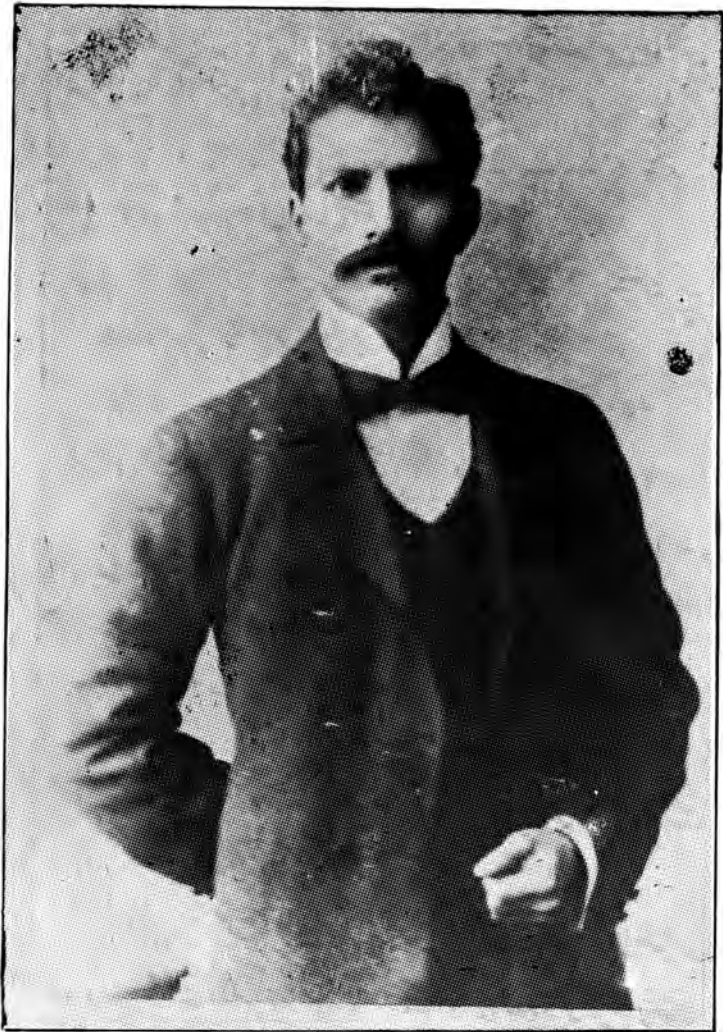
ڈاکٹر محمد عبدالغنی صاحب حصولِ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں قیامِ انگلستان کے دوران

کے مندرجہ ذیل اشعار رقم کرنے پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے۔

کسے کز خامۂ عنبر فشانش
بہ لندن شہرہ شد حسنِ بیانش
چناں دادِ سخن داد آں سخنور
کہ شد ساکت عدوے وے چو پیکر
گلیڈسٹون باآن فضل وکمالش
بہ تردیدش نشد ہرگز مجالش
چناں دنداں شکن دادش جوابے
نماندش چارۂ جز پیچ وتابے
بتائیدِ حقوقِ آلِ عثمان [1]
بہ برہان و دلائل شد دُر افشاں
زنقریر و مقالاتِ پراثرش
نبودش مقصدے جز خدمتِ دیں
نہ امیراز درِ عبد الحمیدش [2]
کہ بد سر بردرِ ربِّ مجیدش [3]

ترجمہ :- "ڈاکٹر عبد الغنی وہ شخص ہے جس کے عنبر فشاں قلم کی وجہ سے اس کے حسن بیان کی شہرت تمام لندن میں ہوگئی۔

وزیر اعظم گلیڈسٹون کو اپنے فضل وکمال کے باوجود دار العوام میں خلافتِ ترکیہ کے متعلق ڈاکٹر عبد الغنی کے مسکت دلائل کے رد کرنے کی مجال نہ ہوسکی۔

---

[1] ترکی کا خاندانِ عثمانیہ [2] خلیفہ عبد الحمید کا تعلق خاندانِ عثمانیہ سے تھا۔
[3] یہ اشعار عاصی کے نغمۂ درد کے صفحہ ۲۹ سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی نے موصوف کو ایسے دنداں شکن جواب دیئے کہ موصوف کے پاس سوائے کڑھنے اور مضطرب ہونیکے کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔

ڈاکٹر دارالعوام میں خلافتِ عثمانیہ یعنی خلافتِ ترکیہ کے حقوق کی حمایت میں اپنے دلائل و براہین کے موتی بکھیرتا رہا۔

ایسی تقریریں کرنے اور مقالات پڑھنے سے ڈاکٹر کا مقصد سوائے خدمت اسلام کے کچھ اور نہ تھا۔

اور نہ ہی ڈاکٹر کے سامنے اس پُرگوئی کے ذریعے خلیفہ عبدالحمید عثمانیہ کے دروازے سے کچھ حاصل کرنے کا طمع تھا۔ اس عدم حرص کا سبب یہ تھا کہ ڈاکٹر سرکارِ مجید کی دہلیز پر جھکا ہوا تھا۔"

ان دنوں غیر ملکی استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنیکی غرض سے برصغیر ہند میں کوششیں جاری تھیں۔ سرسید کی علمی و ادبی تحریک زوروں پر تھی۔ انگریز کیخلاف نفرت عام ہو رہی تھی، خاص طور پہ مذہبی گھرانوں میں یہ نفرت زوروں پر تھی۔ اس سبب سے ڈاکٹر صاحب نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تکمیل تعلیم کے بعد برطانوی ہند میں ملازمت نہیں کریں گے۔ انگریزی حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو بہت بڑی جاگیر اور بہت زیادہ تنخواہ کی پیش کش کی تاکہ وہ بعد از حصول تعلیم ہند کو لوٹ آئیں اور یہاں ملازمت کریں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ آخر جب برطانوی حکومت نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے خلاف سحر انگیز تقریریں کرنا بند نہیں کر رہے تو اس نے ان کا سٹیٹ سکالرشپ روک دیا۔[1] ترکی کی حکومت نے جسکی حمایت میں ڈاکٹر صاحب دارالعوام لندن میں حکومتِ برطانیہ کی زبردست

---

[1] 'احوال و آثار' صفحہ ۱۵

مخالفت کرتے رہے تھے انہیں ترکی میں آنے اور خلافت ترکیہ کے لئے مزید کام کرنے کی دعوت دی۔

اس اثنا میں نائب السلطنت افغانستان سردار نصر اللہ خان[1] ملکہ وکٹوریہ کی دعوت پر ۱۸۹۵ء میں لندن پہنچا۔ اسے اسلامی جذبے سے سرشار نوجوان ڈاکٹر عبد الغنی کو ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ نائب السلطنت نے امیر عبد الرحمان خان کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کو افغانستان آنے اور اسکی خدمت کرنے کی پیشکش کی۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر صاحب نے سردار نصر اللہ خان اور ملکہ وکٹوریا کے درمیان بات چیت کے لئے ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔[2]

حبیبی نے یہ جو لکھا کہ سردار نصر اللہ خان اور ڈاکٹر صاحب کی لندن میں ملاقات ۱۸۹۵ء میں ہوئی درست نہیں۔ سردار موصوف واقعی ۱۸۹۵ء میں انگلستان گیا تھا اور خود ڈاکٹر صاحب اسکی تصدیق یوں کرتے ہیں۔ امیر عبد الرحمن خان کے عہد کا دوسرا اہم واقعہ اس کے دوسرے بیٹے شہزادہ نصر اللہ خان کا ۱۸۹۵ء میں برطانیہ کو جانا ہے۔ ملکۂ برطانیہ کی دعوت پر شہزادے کی کابل سے روانگی اپریل میں وقوع پذیر ہوئی اور وہ مئی میں لندن پہنچا۔[3] مگر اس حقیقت کا کیا علاج کہ ڈاکٹر صاحب انگلستان سے فارغ التحصیل ہو کر اور کابل میں چند برس گذار کر ۱۸۹۳ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذیل والی عبارت اس کا ثبوت ہے:۔

اس اثنا میں میں رخصت پر ہندوستان چلا آیا اور انجمن حمایت اسلام لاہور نے مجھے پرنسپل کا عہدہ پیش کیا۔ اس طرح میں تین سال لاہور میں رہا۔[4] سردار نصر اللہ خان دو بار لندن گیا ہو گا۔ اور ڈاکٹر صاحب سے لندن میں ملاقات

---

[1] یہ امیر عبد الرحمان والئی افغانستان کا بیٹا اور امیر حبیب اللہ خان کا بھائی تھا۔
[1] وجنبش مشروطیت، صفحہ ۶۳

[3] "اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان" صفحہ ۲۱۵

[4] "اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچویشن ان سنٹرل ایشیا" صفحہ ۸

اس کے پہلے سفر کے دوران ہوئی ہوگی۔

سردار نصراللہ خان کے ہمراہ ان کے ایک مصاحب حاجی ملا سرور بھی لندن گئے تھے۔ سردار نصراللہ خان کا ذہن کی طرف اچھا خاصا میلانِ طبع تھا۔ وہ عموماً اپنے گرد علمائے دین کا ایک حلقہ جمع رکھتا[1]۔ ملا محمد سرور جنہیں وہ اپنے ہمراہ انگلستان لے گیا تھا علماء کے اس گروہ میں سے تھے۔ لندن میں ملا صاحب مذکور سے بھی ڈاکٹر صاحب کا تعارف اور ملاقات ہوئی۔ بعد میں کابل کے قیام کے دوران یہ سابقہ ملاقات گہری دوستی کی حد تک پہنچ گئی۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب کو طویل عرصہ کے لئے قید خانے میں جانا پڑا تو حاجی ملا سرور نے وقت کی نزاکت اور مصلحت کے پیش نظر تغافل سے کام لیا ڈاکٹر صاحب نے قید خانے سے گلے شکوے کے طور پر فارسی زبان میں اپنی یا ایک طویل نظم جسے آپ تماشا کہہ سکتے ہیں "فریادِ مینائے مسافر" کے زیرِ عنوان لکھی، اس کے ابتدائی دو شعر ملاحظہ ہوں:

کجائی اے انیس من کجائی
ز حالِ زارِ من غافل چرائی
رفیقِ صادقم بودی شب و روز
سرائیدیم بس نغماتِ پُرسوز

ترجمہ:

"اے میرے مونس دوست حاجی ملا محمد سرور! تو کہاں ہے؟ اور تو میرے خراب حال سے اتنا بے خبر کیوں ہے؟

تو دن رات یعنی ہر وقت میرا سچا دوست بنا رہتا تھا اور ہم دونوں مل کر پُرسوز نغمے گایا کرتے تھے۔"

---

[1] "نگاہ بہ عہدِ امانی" صفحہ نمبر ۲ و ۲۰ از سید رسول

ڈاکٹر صاحب نے یہ سوچ کر کہ اگر وہ ترکی کے مقابلے میں افغانستان جانے کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ تو دیگر متعدد ملحوظات کے علاوہ برصغیر کی آزادی کے لیئے بہتر اور آسان تر منصوبہ بندی پر عمل کیا جا سکتا ہے بعد از تکمیلِ تعلیم افغانستان جانے کیلئے اپنی رضامندی دے دی۔ امیرِ افغانستان کی طرف سے ان کی بقیہ اعلےٰ تعلیم کے اخراجات کو برداشت کرنے کے لیئے انہیں تسلی دے دی گئی [1] لہذا جریدہ 'امان افغان' کے مدیر میر قاسم کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر صاحب جنکو حکومتِ برطانیہ نے اعلےٰ تعلیم کے حصول کے سلسلے میں کیمبرج بھیجا تھا۔ اپنی تعلیم کے آخری سال میں بیمار ہوگئے اور اس لیئے تکمیلِ تعلیم نہ کر سکے درست نہیں [2] اصلیت وہی ہے جو اوپر بتا دی گئی کہ جب حکومت افغانستان نے ان کی بقیہ تعلیم کے اخراجات کا ذمہ لیا تو باقی اعلےٰ تعلیم کی تکمیل بھی کر لی گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان سے اور انگلستان سے جو تعلیمی ڈگریاں حاصل کیں وہ یہ ہیں :

بی اے، ایم، بی (بیچلر آف میڈیسن) ایل، آر، سی، پی (لائسنشیئیٹ آف رائل کالج آف فزیشن) - ایم، آر، سی، ایس (ممبر آف رائل کالج آف سرجن)

مولوی محمد حسین جالندھری نے ذکر کیا ہے کہ اعلےٰ تعلیم کے حصول کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے نو برس تک انگلستان میں قیام کیا۔ [3]

ڈاکٹر صاحب جب انگلستان سے اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے تو ایک انگریز عمر رسیدہ خاتون کو ماں بنا کر ہمراہ لے آئے۔ وہ بوڑھی خاتون کیوں ہمراہ آئی

---

[1] 'احوال و آثار' صفحہ ۱۵
[2] 'جنبشِ مشروطیت' صفحہ ۶۳
[3] 'جنبشِ مشروطیت' صفحہ ۶۴

پہلی قطار

انگریز بڑھیا خاتون ۔ ڈاکٹر محمد عبد الغنی ۔ عبد الجبار شہید (ڈاکٹر صاحب کا معصوم فرزند) ۔ مولوی محمد چراغ ۔

دوسری قطار

مولوی عبد الرحمٰن و مرتضےٰ (ڈاکٹر صاحب کے دو بھانجے ۔

اس کا سبب یہ ہوا کہ اس کا ایک بیٹا تھا جو ڈاکٹر صاحب کا ہم شکل تھا۔ ڈاکٹر صاحب جب بھی اس راستے سے گذرتے تھے جہاں پر اتفاق سے اس خاتون کی رہائش گاہ تھی تو یہ انہیں غور سے دیکھتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پہ بہت حیرانی تھی۔ آخر ایک دن انہوں نے وجہ پوچھی تو اس خاتون نے رو کر کہا:
'بیٹے! مجھ بد نصیب کا اکلوتا بیٹا تمہارا ہم صورت تھا۔ بد قسمتی سے وہ کسی حادثے میں مارا گیا۔ تمہیں گذرتے دیکھتی ہوں۔ تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا وہ بیٹا گذر رہا ہے۔ جب تک میں تمہیں دیکھتی رہتی ہوں، میرے دل کو کچھ قرار رہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تو میرے پاس رہے یا میں تیرے پاس رہوں اور تجھے دیکھ دیکھ کر اپنے مضطرب دل کو تسکین دے لیا کروں۔'
ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا' اگر ایسا ہے تو اے ماں! آج سے میں تمہارا بیٹا ہوں۔ جتنا عرصہ میں یہاں انگلستان میں ہوں مجھے یہاں دیکھ کر اپنے دل کو سکون دے لیا کرنا اور جب میں ہندوستان کو لوٹوں تو پھر میرے ساتھ وہاں چلی جانا۔' چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس بوڑھی خاتون کو اپنے ہمراہ اپنے آبائی قصبہ جلالپور میں لے آئے۔

جب وہ خاتون ڈاکٹر صاحب کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کو آئی تو لاہور کے ایک بیرسٹر جلال الدین نے کہا' ڈاکٹر صاحب! یہ کیا بات ہے لوگ تو ولایت سے انگریز بیویاں ساتھ لاتے ہیں آپ انگریز ماں ساتھ لائے ہیں؟' [1] بعد ازاں جب ڈاکٹر صاحب عازم کابل ہوئے تو اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ پھر کابل ہی میں فوت ہوئی اور وہیں مدفون ہوئی۔ [2]

---

[1] بیان از ناظہور الحق نبیرہ ڈاکٹر صاحب مغفور
[2] بیان از حافظ عبد المجید نجفی بن مولانا نجف علی خان صاحب مغفور

باب دوم

ڈاکٹر صاحب بعہد امیر عبدالرّحمٰن خان

کابل کو روانگی و قیام:۔ ڈاکٹر صاحب لندن سے ۱۸۹۰ء میں فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد افغانستان روانہ ہوگئے۔ اور امیر عبدالرحمن خان کے پرائیویٹ انگلش سیکریٹری مقرر ہوگئے[1] وہ اپنے منظوم تمثیل فریادِ مینائے مسافر میں کابل کے سفر اور امیر عبدالرحمٰن خان فرمانروائے افغانستان کی طرف سے پذیرائی کی بابت نہایت دلپذیر انداز میں کہتے ہیں۔

کنارِ آبِ دریا سے پریدم ۔ بہ بستان سرا بستان رسیدم
زمانے چند پائیدیم درے ۔ دہر نغمہ سرائیدیم درے
زنیرنگِ نوائے ما غریبان ۔ بسے مسرور شد دارائے بستان
گلستان اندر آمد با مدارے ۔ تبسم کرد و فرمود ایں خطابے
کہ اے مینائے خوش خوان و خوش الحان ۔ صدائت تازہ سے سازد دل وجاں
نوائت غنچۂ دل سے کشاید ۔ ز دل صبر و زجاں ہوشم رباید
بخواہم کاندریں گلزار باشی ۔ بدیگر طائرانم یار باشی
بمہر و لطف ایشاں را بیاموز ۔ نوائے جاں فزا و خاطر افروز
دریں بستان سرا آزاد ہستی ۔ بجنبل طائراں استاد ہستی
ترا پابندیٔ تار و قفس نیست ۔ بہ پروازت مزاحم ہیچ کس نیست

ترجمہ: میں (عبدالغنی) ایک مینا کی طرح دریائے کابل کے کنارے اڑ کے (امیر عبدالرحمٰن) کے محل بستان سرا میں پہنچا جو باافراط برگ و گل کے سبب واقعی بوستان بنا ہوا تھا

---

[1] احوال و آثار صفحہ نمبر ۱۶، نیز اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچوئیشن ان سنٹرل ایشیا، سرورق

میں کچھ مدت اس میں رہا اور خوش الحانی سے نغمے گاتا رہا۔
مجھ مسافر مینا کی جادو اثر آواز سے بوستان کا مالک یعنی امیر عبدالرحمن خان بہت خوش ہوا۔
وہ ایک دن اس بوستان میں آیا اور مسکراتے ہوئے مجھ سے یوں مخاطب ہوا۔
اے خوش خواں وخوش الحان مینا! تیری آواز دل وجان کو تازگی عطا کرنے والی ہے۔
تیرے گیت سے دل کی کلی کھلی اٹھتی ہے اور دل وجان سے صبر اور ہوش جاتے رہتے ہیں۔
میری خواہش ہے کہ تو اس باغ میں ٹھہرا رہے اور میرے اس باغ کے دوسرے پرندوں کا دوست بنا رہے۔
میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تو محبت اور مہربانی سے ان پرندوں کو کچھ سکھائے اور انہیں جان افزا اور خاطر افروز گیت سنائے۔
اے مینا! جا، تو اس باغ میں بالکل آزاد ہے۔ اور باقی پرندوں کی جمعیت کا استاد ہے۔
تمہیں رسی یا پنجرے کی کوئی قید نہیں ہے اور اِدھر سے اُدھر اڑ کر جانے میں تمہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔
پروفیسر مولوی محمد حسین جالندھری[1] کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی کے تعلیمی واخلاقی اوصاف قابل رشک تھے۔ سٹیٹ سکالرشپ پر پنجاب سے ان کا انتخاب ہوا تھا انہوں نے ۹ برس انگلستان میں قیام کیا اور وہ وہاں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں منہمک رہے۔ وہ لندن کے اسلامی اجتماعات اور مجالس میں ایک فصیح مقرر کے طور پر معروف تھے۔ امیر عبدالرحمن خان نے انہیں اپنے سکرٹری کی حیثیت سے کابل کو آنے

---

[1] مولف 'افغان بادشاہ' و 'انقلاب افغانستان'

کی دعوت دی۔ میر قاسم مدیر "امانِ افغان" کا بیان ہے کہ برصغیر ہند سے آنے والے اساتذہ کا پہلا گروہ جو افغانستان آیا ڈاکٹر عبدالغنی، ان کے بھائیوں اور چند ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ وہ افغانستان میں تعلیم منتقل کرنے اور مدرسہ حبیبیہ کابل کا انتظام چلانے کی غرض سے آئے تھے۔ برطانوی حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو کیمبرج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے برطانیہ بھیجا۔

ڈاکٹر شیخ اقبال شیدائی نے بھی اپنے مقالہ 'ایک انقلابی کی سرگذشت' میں اسی قسم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے " ڈاکٹر صاحب جلال پور جٹاں ضلع گجرات (پنجاب) کے رہنے والے تھے وہ امیر عبدالرحمن کے زمانے میں حکومتِ افغانستان کی ملازمت میں آئے امیر حبیب اللہ خان نے انہیں حبیبیہ کالج کابل کا پرنسپل مقرر کیا۔ ان کے دو اور بھائی تھے۔ بڑے کا نام مولانا نجف علی خان اور چھوٹے کا نام مولوی محمد چراغ تھا۔

اقبال شیدائی صاحب کو ان کے ایک اور چھوٹے بھائی حکیم غلام حیدر کا علم ہی نہیں تھا وہ مولوی محمد چراغ سے بڑے تھے۔ انگریزوں کی ایک خفیہ رپورٹ میں یوں لکھا ہوا ہے " ڈاکٹر عبدالغنی کے دو اور بھائی حکیم غلام حیدر آف لاہور اور سکول ماسٹر مولوی محمد چراغ آف راولپنڈی بھی تھے۔ اغلباً ان ایام میں جب یہ رپورٹ لکھی گئی حکیم غلام حیدر صاحب لاہور میں مکین تھے جبکہ مولوی محمد چراغ راولپنڈی میں متعین تھے۔

اب سردار عبدالرحمن خان والئ افغانستان کی ذات کے بارے میں کچھ باتیں ہو جائیں۔

احوال سردار عبدالرحمن خان

عبدالرحمن خان کا معجزانہ طور پر پڑھ لکھ سکنا

خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ عبدالرحمن جب لڑکپن میں تھا تو پڑھ لکھ

---

[۵] صفحہ نمبر ۱۷ مارچ ۱۹۰۸ء 'Who's who in Afghanistan'

نہیں سکتا تھا۔ عبدالرحمٰن کے اپنے الفاظ ہیں کہ "میں قارئین کو اپنے متعلق ایک عجیب بات بتانے لگا ہوں جس کا ذکر کرنے پر مجھے مسرت ہو رہی ہے ایک دن جب میں دربار لگائے ہوئے تھا مجھے امیر محمد اعظم خان کی لڑکی سے ایک خط موصول ہوا۔ وہ لڑکی کابل میں رہتی تھی اور میری منگیتر تھی۔ اس نے پیغامبر کو ہدایت کی کہ وہ خط صرف میرے ہاتھ میں دے اور وہ خط کسی اور کو نہ دکھایا جائے اور یہ کہ جواب میں ہی لکھوں اور میں ہی جواب کو سربمہر کردوں میں کسی اور مقام پر بتا چکا ہوں کہ میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا اور جو تھوڑا بہت میں نے بچپن میں سیکھا تھا وہ بھی میں بھول چکا تھا۔ اس خط کی وصولی پر قارئین میری لوکھلاہٹ کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ میں تو اپنے تئیں ایک بڑا آدمی کہلانے پر بہت گھمنڈ کیا کرتا ہوں۔ حالانکہ میں اسقدر جاہل ہونے کے سبب بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ میں رات کو خلوت میں بہت رویا اور اپنے اللہ سے بہت عجز کے ساتھ التجا کی کہ میرے دل کو منوّر فرما تا کہ پڑھ لکھ سکوں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ تو اپنی مخلوق کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں کریگا۔ آخر رو رو کر سحر کے وقت میں سو گیا۔ میں نے خواب میں ایک پاکیزہ شخص کو دیکھا اس نے سر پر عمامہ باندھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں عصا تھا وہ بزرگ میرے بستر کے قریب پہنچا اور فرمانے لگا۔

"عبدالرحمٰن اٹھو اور پڑھو" اچانک میری آنکھ کھل گئی اور کسی (بزرگ) کو اپنے سامنے نہ پا کر میں دوبارہ سو گیا۔ پھر وہی مبارک صورت نمودار ہوئی اور اس نے فرمایا "میں کہتا ہوں پڑھ اور لکھ اور تم اسکی بجائے سو جاتے ہو"

---

(۱) A Brief Political History of Afghanistan' P 145
'A Review of The Political Situation in Central Asia' P 18

میں ہچکچایا اور اس ہچکچاہٹ میں دوسری بار بیدار ہوگیا اور جب مجھے کوئی شخص نظر نہ آیا تو میں پھر سو گیا۔ تیسری دفعہ اس بزرگ نے ظاہر ہوکر زور دار لہجے میں فرمایا " اگر تم سو گئے " تو میں اس نوکدار عصا سے تمہارا سینہ چھید دونگا۔ اس پر میں سہم گیا اور جاگ پڑا۔ اور اس دفعہ میں نہ سویا میں نے اپنے ملازم کو کہا کہ قلم اور کاغذ لاؤ اور میں نے ان حروف کو سوچنا شروع کیا جو میں لڑکپن میں لکھا کرتا تھا۔ اللہ تعالی کی غیر مرئی طاقت ان حروف کو ایک ایک کر کے میرے دماغ میں لا رہی تھی جو کچھ میں نے ماضی میں پڑھا ہوا تھا وہ میری یاد داشت میں بتدریج عود کر آیا اور میں نے کاغذ پر ایک لفظ پھر دوسرا لفظ اور پھر تیسرا لفظ لکھنا شروع کیا اس طرح طلوع آفتاب سے پہلے پہلے میں نے ساٹھ ستر سطور کا ایک خط لکھ مارا۔ کچھ حروف آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے اور باقی کے حروف بھی مشکل ہی سے مکمل تھے میں نے جب اپنے لکھے ہوئے کو دہرایا تو مجھے پتہ چلا کہ میں تو یہ سارے کا سارا پڑھ سکتا ہوں اور مجھے ان لفظی غلطیوں کا بھی علم ہوگیا جو میں نے کی تھیں اور وہ تعداد میں زیادہ نہیں تھیں۔ میں نے اس لکھے ہوئے کو پھاڑ دیا اور بہتر کر کے دوبارہ لکھا اس پر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

اس صبح گورنروں کی طرف سے آئے ہوئے ایک دو خطوط کو میں نے کھولا اور یہ جان کر کہ مجھے خطوط کے نفس مضمون کی سمجھ آرہی ہے، بے انتہا مسرت ہوئی۔ جب دربار منعقد کرنے کا وقت آپہنچا تو منشی (سکریٹری) جس کا کام خطوط پڑھنا تھا حسب معمول آیا مگر میں نے اسے کہدیا کہ آج خطوط میں خود پڑھوں گا اور تم میری غلطیاں درست کرنا۔ وہ مسکرایا اور بولا "مگر جناب والا کو تو پڑھنا نہیں آتا" اس کی اس بات پر میں نے ایک خط کھولا اور کہا کہ " یہ دیکھو میں پڑھ سکتا ہوں" بس اس دن سے میں نے خود ہی خطوط کو پڑھنا اور ان کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔

عبدالرحمٰن خان کی شخصیت :- ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اپنے ایک باغی سردار شہزادہ حسن کی سرکوبی کر چکنے کے بعد امیر عبدالرحمٰن خان نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رہتا ہے اور اسی بنا پر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں پوری دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

امیر موصوف نے اپنی سرگذشت میں بھی لکھا " میرا دل اسقدر مضبوط ہے کہ اگر مجھے تمام جہاں کے لوگوں کا بھی سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ میرے پاؤں میں کیڑے مکوڑے دکھائی دیں گے۔ یہ بات میں اللہ کا نام لے کر کہہ رہا ہوں اس میں میری اپنی کوئی بہادری نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض ایک جذبہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کیا ہے یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ اگر لوگ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں تو وہ یقیناً انہیں کامیاب کرتا ہے۔ میرے اس عقیدے کا ہی نتیجہ ہے کہ میں آج بادشاہ ہوں [1]

برصغیر ہند کی برطانوی حکومت کے ساتھ عہدنامہ ہونے سے پہلے کچھ خط و کتابت چل رہی تھی۔ عبدالرحمٰن خان کو سرگرفن (Griffin) کی چھٹی کا جواب دینا مطلوب تھا۔ اس غرض کے لئے اس نے اپنی فوج کے سامنے سرگرفن کا وہ خط پڑھا اور اپنے ماتحت افسروں کو اس کا جواب تیار کرنے کو کہا۔ انہوں نے دو دن کی مہلت مانگی اس کے بعد وہ ایک سو مسودے تیار کر لائے۔ ان میں سے کسی میں تو لکھا تھا " اُو انگریزی قوم ہمارا ملک چھوڑ دو ورنہ ہم تمہیں باہر نکال دینگے اور اس کوشش میں اپنی جان دے دینگے ایک میں لکھا تھا " پہلے ہمارے گذشتہ نقصانوں کا ہرجانہ ادا کرو تب ہم تم لوگوں سے بات چیت کرنے کے لئے آمادہ ہونگے " ایک اور میں لکھا تھا " ہمیں ایک سو کروڑ روپیہ چاہیئے۔ تب ہی ہم اپنے قلعے اور بندوقیں تباہ کرنے پر رضامند ہونگے ورنہ ہم ایک انگریز کو بھی پشاور زندہ نہیں پہنچنے دیں گے۔" ایک اور سردار نے لکھا " اُو دھوکے باز کافرو! تم نے ہندوستان دھوکے ہی سے تو حاصل کیا..........

امیر عبدالرحمٰن نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے کہ اس کے بعد میں نے ایک کاغذ اور

---

[1] اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچویشن ان سنٹرل ایشیا صفحہ نمبر ۲۱

اور قلم پکڑا اور اپنے اللہ سے مخاطب ہو کر عرض کی تو جو تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے خط کے مناسب جواب کے لئے مجھ میں جذبہ اور آمد پیدا کر دے چنانچہ میں نے ازبکوں اور افغانوں کے اس لشکر کی موجودگی میں مناسب آداب و تکریم کے ساتھ ایک خط لکھ کر ان سب کو سنایا۔ انہوں نے چار یار کا نعرہ لگایا اور یک زبان ہو کر کہا۔

"اے امیر! یہ خط جو تم نے لکھا ہے بالکل مناسب اور معقول ہے"[1]

امیر عبدالرحمٰن خان نے ان تمام افراد کو چن چن کر ختم کیا جو سازشی یا کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کرنے کے عادی تھے یا تاج و تخت کے دعویدار تھے یا جنہوں نے قومی آزادی کو قربان کیا تھا یا جنہوں نے کابل میں انگریزوں کے عارضی قیام کے دوران کام کرتے ہوئے ملک کے ساتھ غداری اور اپنی ذات کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ امیر نے ایسے لوگوں کو یا تو ملک بدر کیا یا ان سے قید خانے بھر دیئے یا توپ سے ان کے ہاتھ اور پاؤں اور دوسرے اعضاء اڑا دیئے۔ ان کی کھوپڑیاں فٹ بال کی طرح اچھالیں۔ پنجروں میں بند کر کے انہیں اذیتیں دی گئیں۔ ملک میں ان ہیبت ناک سزاؤں کی وجہ سے سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے امیر کی روح ہر جگہ نظر جمائے ہوئے ہے لوگ آپس میں اونچا بولنے کی بجائے سرگوشیاں کرتے تھے۔ تاکہ ہوا کہیں ان کی باتیں امیر کے حساس کانوں تک نہ پہنچا دے۔

امیر عبدالرحمٰن خان نے اپنے پیچھے ایک منظم اور پرسکون سلطنت چھوڑی۔ اس کی سخت گیری کے دور رس مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اپنی وفات سے ذرا قبل اس نے کہا تھا کہ "میں نے ملک سے خانیت کو اس حد تک توڑ دیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کم از کم تیس سال تک امن و امان رہیگا۔ اس مدت تک تو میرے جانشین امن و سکون سے حکومت کر سکیں گے۔ اس کے بعد پھر وہ اپنا بویا کاٹینگے"[2]

امیر عبدالرحمٰن خان درمیانے قد کا باریش شخص تھا وہ بڑا تنومند اور محنتی تھا

---

[1] اے ریویو، صفحہ ۲۸، ۲۹ [2] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان صفحہ ۱۵۹

امورِ سلطنت میں وہ کسی سے مشورہ نہیں کرتا تھا وہ جب تک اپنا کام ختم نہیں کر لیتا تھا سوتا نہیں تھا وہ ہر معاملے کی تہہ تک پہنچتا۔ وہ کسی شخص کی وفاداری کو مختلف طریقوں سے پرکھتا تھا اور جب اسے یقین و اطمینان ہو جاتا تو پھر وہ لوگوں کی شکایات کے باوجود اس پر اعتبار کرتا۔

روس میں اپنے قیام کے دوران اس نے وہاں کے نظامِ جاسوسی کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہوا تھا۔ اس نے وہ نظام افغانستان میں بھی آزمایا تاکہ وہ اپنی شان اور طاقت کو قائم رکھنے کے لئے خوفناک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ اس کا یہ نظام۔ جاسوسی ہر گھر میں داخل ہو گیا۔ تفتیش کے لئے اس نے عورتوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی بھرتی کیا۔

اسے کئی سالوں سے گنٹھیا کا مرض تھا اور اسی سبب سے وہ فوت ہوا۔ اس عارضے میں مبتلا ہونے کے باوجود کھانے پینے کے معاملے میں وہ اپنے ڈاکٹر کی ہدایت پر پوری طرح عمل نہیں کر سکتا تھا اور بے احتیاطی برتتے ہوئے مرغن غذائیں اور پھل وافر مقدار میں کھاتا تھا۔ اس کے ایک وقت کا کھانا چار عام آدمیوں کے لئے کافی ہوتا تھا[1]

امیر عبدالرحمٰن خان ایک غیور افغان رہنما تھا۔ افغان سلطنت کے علاقائی معاملات میں برطانیہ کی ہندوستانی حکومت کی وقتاً فوقتاً بے جا مداخلت اسے بہت زیادہ برہم کر دیتی تھی ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ میں نے کئی بار اس وقت کے ہندوستانی دارالخلافہ کلکتہ سے موصول ہونے والی خط و کتابت کے آمرانہ لہجے پر امیر کو سخت برافروختہ اور اپنے ہاتھوں کی پشت کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے دیکھا۔

ایک دفعہ لندن ٹائمز میں ایک خط چھپا جس میں افغانستان کی بے توقیری کی گئی تھی اور لکھا تھا کہ برطانوی حکومت ایک ہفتے کے اندر افغان علاقے پر قبضہ کر لے گی۔ جب امیر کو اس کی خبر ہوئی تو وہ غضبناک ہو گیا اور اس نے ایک تحریر لکھی

---

[1] اے ریویو صفحہ ۵۵، ۵۶

جو اسی لندن ٹائمز میں چھپی وہ یہ کہ جب تک ایک افغان بھی زندہ ہے کوئی خارجی طاقت افغانستان کا ایک انچ علاقہ بھی نہیں ہتھیا سکتی ہے ۱

یہاں پر ہم پھر ڈاکٹر صاحب کے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو امیر عبدالرحمن خان کے ساتھ کام کرتے ہوئے تقریباً دو سال کا عرصہ گذر چکا تھا اس مختصر سی مدت میں انہیں اپنی اہلیت، مستعدی اور فطانت سے امیر کا خاصا قرب حاصل ہو چکا تھا

مولانا نجف علی خان کا فن ترجمہ :-

ایک بار ڈاکٹر صاحب نے امیر عبدالرحمن خان کے سامنے بر سبیل تذکرہ اپنے برادر بزرگ مولانا نجف علی خان عاصی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی علمی فضیلت اور فن ترجمہ پر ان کے عبور کے بارے میں بتایا۔ امیر پہلے ہی سے اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ مختلف علوم میں عام طور پر اور طب (MEDICINE) میں خاص طور پر انگریزی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کسی ایسے ماہر سے کرایا جائے کہ جو پکا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ چنانچہ امیر نے ڈاکٹر صاحب کے ذریعے مولانا نجف علی خان عاصی کو ۱۸۹۲ء میں شاہی فرمان بھجوا کر کابل بلوا لیا اور اس طرح ترجمے کا معاملہ ان کے سپرد ہو گیا۔ مولانا سے پہلے آرنلڈ نامی ایک انگریز اس شعبے کا مہتمم تھا۔ چونکہ وہ فارسی زبان اور اس کی موشگافیوں سے پوری طرح باخبر نہیں تھا۔ اس لئے فن ترجمہ میں وہ کامیاب ثابت نہ ہو سکا۔ مولانا نے اس حقیقتِ حال سے امیر موصوف کو ان الفاظ میں آگاہ کیا ؎

آرنلڈ از انتظام ترجماناں قاصر است گرچہ در علم و کمالش نیست یارائے سخن

---

۱ ۔۔۔ پولیٹیکل ۔۔۔ افغانستان صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸

ہر یکے موزون باشد لیک بہر کار خاص نیست دیبا باف مثل آنکہ مے باف درسن[1]

ترجمہ :۔ آرنلڈ کے بلند علم و فضل میں شک و شبہ نہیں مگر وہ کتابوں کا فارسی زبان میں بدرجہ احسن ترجمہ کر سکنے سے عاجز ہے۔

ہر کوئی شخص کسی نہ کسی مخصوص کام کے لئے موزون ہوتا ہے۔ دیبا بنانے والا اپنے فن میں قابل ہے اور رسیاں بننے والا اپنے کسب میں ماہر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسیاں بننے والے کو دیبا بنانے والے پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔

مولانا نجف علی کا تقرر بطور اتالیق :۔

مولانا نجف علی خان صاحب عاصیؔ کو شہزادہ امان اللہ خان کی اتالیقی کے فرائض بھی سپرد کئے گئے۔ شیخ اقبال شیدائی نے بھی اپنے مضمون " ایک انقلابی کی سرگذشت " میں اس کی تصدیق کی ہے۔ میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا نے لکھا "مولانا نجف علی خان اور ڈاکٹر عبدالغنی خان میرے بھی استاد رہے اور مولانا صاحب افغانستان کے شاہی خاندان کے شہزادوں کے بھی استاد رہے۔

باپ کی زندگی میں حبیب اللہ خان کا بااختیار ہونا

یہ امر ملحوظ رہے کہ شہزادہ حبیب اللہ خان اپنے باپ امیر عبدالرحمن خان کے حین حیات ملک کے اندرونی معاملات میں کافی حد تک بااختیار تھا۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ امیر عبدالرحمن خان عمر ڈھل جانے اور گنٹھیا کے عارضے میں مبتلا ہونے کے سبب امورِ سلطنت خود حسبِ منشاء بطریقِ احسن چلا سکنے کے اہل نہیں رہا تھا۔ لہٰذا سردار حبیب اللہ خان ریاست کی بہتری کے لئے جو پالیسی اختیار کرتا۔ امیر عبدالرحمن خان اسے عموماً منظور کر لیتا۔

---

[1] احوال و آثار صفحہ ۱۶، ۱۷ ، مخطوط بیاض از مولانا نجف علی خان عاصیؔ صفحہ ۶۰۔

اسی غرض سے ہم یہاں پر اس نکتے کی وضاحت کر رہے ہیں تا کہ اس کتاب میں جہاں کہیں امیر عبد الرحمن خان کی زندگی کے دوران ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے با اختیار حبیب اللہ خان کا ذکر آئے تو قارئین تحیّر اور مغالطہ محسوس نہ کریں۔

تعلیم عمومی کی اشاعت :-

ڈاکٹر صاحب نے سردار حبیب اللہ خان کی خواہش اور ایما پر افغانستان میں تعلیم عمومی (GENERAL EDUCATION) کی اشاعت کا کام امیر عبد الرحمن کے عہد کے آخری حصہ میں شروع کیا۔ سردار حبیب اللہ خان شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت ملک کی سب سے اہم ضرورت تعلیم عمومی کی اشاعت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے بھائی مولانا نجف علی خان صاحب کی معیت میں جہالت اور ناخواندگی کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ امیر حبیب اللہ خان کابل میں ایک مدرسہ ــــــ 'مکتب حبیبیہ' قائم کرنا بہت ضروری سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے اور میرے برادر بزرگوار کو اس کام پر مامور کیا۔ ہم کابل شہر سے ۳۰۰ طلبہ اکٹھے کئے۔ اور ان کی جماعت بندی کی۔ برصغیر ہند سے تربیت یافتہ گریجویٹ منگوائے گئے تاکہ وہ انہیں زیورِ علم سے آراستہ کریں۔ بعد میں ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی اسی طرح کے ۱۳ مدرسے کھولے گئے۔ [1]

مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں "مکتب حبیبیہ کا نظم و نسق تمام کا تمام برصغیر ہند کے افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ جب سے حبیب اللہ خان نے اپنی توجہ علوم و فنون کے اجراء کی طرف مبذول کی ہے۔ برصغیر کے اساتذہ کا ایک گروہ کابل میں مقیم ہے اور ان میں سے اکثر پنجابی ہیں [2]

---

[1] 'A BRIEF POLITICAL HISTORY OF AFGHANISTAN' Vol: II, P 233.

[2] 'کابل میں سات سال'

اسلامیہ کالج لاہور:- ڈاکٹر صاحب ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء تک
انجمن حمایت اسلام کے تحت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ وہ ۱۸۹۳ء میں اپنے
اعزا کی ملاقات کے لئے افغان حکومت سے رخصت لے کر کابل سے وطن کو روانہ
ہوئے۔ مگر وہ راستے میں جلال آباد کے مقام پر روک لئے گئے اور دونوں تک
انہیں وہیں اپنی جامہ تلاشی کے سلسلے میں ٹھہرنا پڑا [۱] ان کے سامان سفر کی
غائر تلاشی کی وجہ یہ تھی کہ کچھ افغان حاسدوں اور سازشیوں نے امیر حبیب اللہ خان
کو یہ غلط رپورٹ دی کہ ڈاکٹر صاحب انگریزوں کے لئے افغانستان کے کچھ خفیہ
کاغذات اور دستاویزات اپنے ہمراہ ہند کو لے جا رہے ہیں۔

افغان عوام کی اکثریت شروع ہی سے افترا پرداز اور شر انگیز
رہی ہے۔ اس کی بابت ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنے منظوم تمثیلچے "فریاد مینائے مسافر"
کے دیباچے میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "افغانستان کے لوگوں کا دماغ فتنہ و
فساد کے لیے خاص اہلیت رکھتا ہے۔ اور وہ افترا اور بہتان کو حقیقت کا رنگ
دینے میں ید طولےٰ کے مالک ہیں۔
عزیز ہندی افغانوں کے اس طبقے کی نقشہ کشی یوں کرتا ہے۔ "جن اشخاص نے
افغانستان کو دیکھا ہے اور جن کو وہاں کے باشندوں کی طبیعت سے آشنا ہونے کا
اچھی طرح موقع ملا ہے وہ بیک نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ افغان کتنی جلدی اپنے
حریف مد مقابل کے برخلاف محض اس غرض سے ہیبت اندازی کے مظاہروں پر اتر
آتے ہیں کہ کسی طرح ان کا حریف ان حیلوں سے جلد مرعوب ہو جائے۔ لیکن جب ان کا
مد مقابل درجے میں ان کے برابر یا اونچا ہو تو وہ خفیہ خفیہ اس کے برخلاف سازشوں
کا جال پھیلا کر اس کے گرد و پیش ایک ایسا عالم پیدا کر دیتے ہیں جسکی وہ تاب لا سکتا ہو۔ [۲]

صـ۵۳
[۱] - بیان از حافظ عبد المجید نجفی [۲] زوال غازی امان اللہ (انقلاب افغانستان ۱۹۲۸ء)
و [۱] میر قاسم جنبش مشروطیت در افغانستان صفحہ ۶۳

خود امیر عبدالرحمٰن خان نے ان افغانوں کے سفاکانہ رویے اور ان کی طوائف الملوکی سے اکتا کر کہا "بہت سے مواقع پر میرے اپنے لوگوں کے بُرے طرز عمل سے میرا حوصلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ لوگ آئے دن بغاوتیں کرتے رہتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اپنے مخالفوں کے خلاف جھوٹی اطلاعات دیتے رہتے ہیں۔ میں ان کی اس منفی روش سے بہت زیادہ تنگ آ گیا ہوں اور بعض دفعہ تو اس نتیجے پر پہنچنے لگتا ہوں کہ یہ اپنی وحشیانہ حالت کو بدلنے والے نہیں اور ان کی ریشہ دوانیاں ختم ہونیوالی نہیں اور انہیں قوت و کردار میں اپنے ہمسایہ ممالک کے برابر لانا ناممکن ہے۔[۱]

مولانا عبیداللہ سندھی بھی افغانوں کی بربریت کے متعلق کہتے ہیں، امیر عبدالرحمٰن خان کا عہدِ حکومت افغانستان کے لئے نہایت جابرانہ اور آہنی عہد تھا جس میں لاکھوں افراد بیک گردشِ چشم بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ لیکن اس پر بھی وہ ذہنیت کسی طرح سے اس جبر و استبداد کی شدت سے کم نہ ہو سکتی تھی۔[۲]

ڈاکٹر صاحب کے رختِ سفر کو اچھی طرح الٹ پلٹ کرنے کے باوجود ان سے کوئی ایسا رازدارانہ مواد نہ مل سکا۔ جس کی بابت الزام تراشی کی گئی تھی۔ جب امیر حبیب اللہ خان کی اس سلسلے میں تشفی ہو گئی تو اس نے بعد میں

---

[۱] 'The life of Amir Abur Rahman' edited by Mir Munshi Sultan Mohammad Hindustani ; Also mentioned in 'Through Amanullah's Afghanistan' by K.H. Katrak.

[۲] مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگذشت از مولانا عبداللہ انصاری و 'کابل میں سات سال' صفحہ ۴۸ از مولانا عبیداللہ سندھی

ڈاکٹر صاحب کو معذرت خواہی کی ایک چٹھی بھیج دی [1]

افغان حکومت کی جانب سے اس بے جا جامہ تلاشی کے سلوک نے ڈاکٹر صاحب کو بہت بد دل کر دیا۔ وہ اس لئے بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوئے کیونکہ انہوں نے اس مسلم (افغان) حکومت کے ہاتھوں اپنی بے عزتی دیکھی جس کی خدمت کی خاطر انہوں نے انگریزوں کی پیش کردہ جاگیروں اور اعلیٰ عہدے اور خطیر مشاہرے کو ٹھکرا دیا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب افغانستان یا ترکی کی ملازمت و خدمت کرنے کی بجائے ان کے زیردست رہ کر غلام ہند میں بطور SECRETARY To The viceROY. ملازمت کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے محکوم ہندوستان میں رہنے کی بجائے عازم افغانستان ہونے کو ترجیح دی تھی۔

اب جب ڈاکٹر صاحب اپنے اقربا کو ملنے برصغیر پاک و ہند کو آہی گئے تھے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس افغانستان کو نہیں جائیں گے۔ اتنے میں انجمن حمایتِ اسلام نے انہیں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے کی پیش کش کی جسے انہوں نے برضا و رغبت قبول کر لیا۔ انہوں نے اسلامیہ کالج کی ملازمت ایک اور ارادے کے پیش نظر بھی قبول کر لی، وہ یہ کہ اس کالج کی مسلم نئی پود کی تعلیم و تربیت ڈاکٹر صاحب ایسے خطوط پر کریں کہ اسے اپنی اسلامی اقدار سے محبت ہو اور نیز انہیں حصول آزادی کے لئے تڑپ پیدا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے تربیت یافتہ انہی نوجوانوں نے پھر بعد میں تحریک آزادی میں ولولہ انگیز کام کیا جس کے نتیجے میں بالآخر پاکستان کی تشکیل کے لئے راہ ہموار ہوئی۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلم نونہالوں کو نعمتِ حریت سے سرشار کرنے کے سلسلے میں ان کی کتاب A REVIEW OF THE POLITICAL SITUATION IN CENTRAL ASIA جو ۱۹۲۱ء میں چھپی بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

اسی کتاب میں یہ اشعار بھی ہیں۔

---

[1] میر قاسم "جنبشِ مشروطیت در افغانستان"، صفحہ ۶۳

In your own schools let your children be taught,
To be like Those heroes who lived to make Islam,
And in their lives on us its blessings brought,
Be firm, let naught your resolution shake.

ترجمہ :۔ اپنے مدارس میں تم اپنے مسلمان بچوں کو اس طرز پر تعلیم دو کہ وہ اس تعلیم سے اپنے اجداد کی طرح ہیرو بن سکیں۔

اسلام ہمارے اجداد کی زندگیوں میں اپنی برکتیں اور رحمتیں لایا۔ تم مضبوط ارادے کے مالک بنے رہو اور اپنے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دو۔ پھر دیکھ لینا اسلام ہماری زندگیوں میں بھی اپنی برکتیں اور رحمتیں لائے گا۔ (ترجمہ ختم)

ان اشعار سے اس امر کی بھی عکاسی ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے عملاً بھی اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت بسلسلہ شعائر اسلام و حُبِ آزادی ضرور کی ہوگی۔

تحریک ترک موالات کے ضمن میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اگر آزاد ڈائرکٹوریٹ [1] (واقع کشمیری دروازہ لاہور) کا آزاد ڈائریکٹر بننا منظور کیا تو اس لئے کہ ایک تو انگریزوں کے جاری کردہ تعلیمی اداروں سے مقاطعہ ہو اور دوم مسلم طلبہ کو اپنے اپنے الگ قائم کردہ سکولوں اور کالجوں میں اسلامی نظریۂ حیات جس کے تحت نعمتِ آزادی اور جہاد برائے حصول آزادی از خود شامل ہے کے مطابق تعلیم فراہم کی جائے

۱۸۹۶ء میں امیر حبیب اللہ خان نے ڈاکٹر صاحب کو ایک شاہی فرمان بھیجا۔ اور اس میں لکھا کہ " ایک راسخ العقیدہ مسلمان کو ایک اسلامی مملکت کی خدمت کرنے میں متذبذب نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ایک اور تاکیدی مراسلہ بھیجا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے امیر کے یہ دونوں مراسلے انجمن حمایتِ اسلام کی انتظامیہ کو

---

[1] بیان محمد اسلم مرحوم

دکھا کر اپنا استعفیٰ پیش کیا جسے منظور کر لیا گیا اس طرح ڈاکٹر صاحب دوبارہ ۱۸۹۶ء میں کابل چلے گئے[1]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے افغانستان دوبارہ جانے کے لئے امیر کی دعوت کیوں قبول کی درحالیکہ وہاں کی حکومت نے تین سال قبل ان پر خفیہ اہم کاغذات کی سمگلنگ کا الزام لگایا تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس کا یہ جواب بھی ہے کہ ان کے دو بھائی مولانا نجف علی خان اور مولوی محمد چراغ خان کابل میں ہی مقیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب اگر کابل کو واپس جانے سے انکار کرتے تو انہیں خدشہ تھا کہ وہاں کی حکومت کے ہاتھوں ان دونوں بھائیوں کی خیر نہیں ہوگی۔ اس لئے بھی خوشی سے یا ناخوشی سے وہ چل دیئے[2]

اس امر کے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ امیر حبیب اللہ خان جنسی بھوک میں مبتلا تھا۔ جس سے اس کے قوا بتدریج مضمحل ہوتے چلے گئے اور کسی مسئلے کے حل کے مقابلے میں اس کی قوتِ فیصلہ بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی دو کتابوں

A Review of The political Situation in Central Asia. اور

A brief Political History of Afghanistan.

میں ذکر کیا ہے۔ اور مولانا عبیداللہ سندھی نے بھی تذکرہ کیا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان کے ہاں تین سو نکاح بستہ عورتیں تھیں ماہر ڈاکٹر اسے رات کے وقت انجکشن لگاتے تو اس کے اندر خواہش پیدا ہوتی اور امیر صاحب ایک عورت کو بلاتے تھے۔۔۔۔۔۔

پھر تو یہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ شہری شرفا کی خوبصورت بہو بیٹیوں کی تلاش کے لئے دلالہ عورتوں کو بھیجا جاتا۔۔۔۔۔۔ بعض عفت مآب لڑکیوں نے تو خودکشی کر لی[3]

اعضائے جسمانی کی تخفیف اور قوائے ذہنی کے اضمحلال کی بنا پر جب اس کے سامنے کوئی

---

[1] عبدالحی حبیبی، جنبش مشروطیت صفحہ ۶۳

[2] بیان عبدالمجید نجفی پسر مولانا نجف علیخان[3] کابل میں ستا سال صفحہ ۱۷۶

معمہ پیش ہوتا درحالیکہ درباری سازشی اپنی توانائیاں اسے بہکانے میں صرف کرتے رہتے تھے
اس پر جھنجھلاہٹ کی کیفیت طاری ہوجاتی اور وہ عجلت میں غیر منصفانہ فیصلے کردیتا
یہ جانتے ہوئے بھی کہ پہلی بار ڈاکٹر صاحب اور برادران کو اس کے باپ امیر عبدالرحمن خان
کی خواہش اور اصرار پر کابل آنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا اور یہ علم رکھتے ہوئے بھی کہ
ان بھائیوں (ڈاکٹر عبدالغنی ، مولانا نجف علی اور مولوی محمد چراغ) نے بڑے خلوص
اور ایمانداری سے افغانستان کے مفادات کے لئے کام شروع کیا تھا ۔ اس نے
ڈاکٹر صاحب کی جامہ تلاشی کا حکم دیا اور جب اسے ہوش آیا اور ڈاکٹر صاحب کو
بے جرم پایا تو اس نے اپنی ندامت کا اظہار کیا ۔ اسی طرح ۱۹۰۹ء میں اپنے قوار
کی کمزوری کے سبب سے وہ ایک دفعہ پھر ان بھائیوں کے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں
کا شکار ہوا ۔ اور بغیر تحقیق کے ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کار کو قید خانے
بھیج دیا اور ایسا کرنے میں وہ بھول گیا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس نے عذر خواہی کا مکتوب
لکھ کر ہندوستان سے دوبارہ کابل منگوایا تھا اور دوبارہ واپس پہنچ کر ان بھائیوں
اور ان کے ساتھیوں نے گوناگوں یادگار خدمات انجام دی تھیں ۔

اب ہم پھر اسلامیہ کالج لاہور کے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں ۔ اسلامیہ کالج سول لائنز
کے حبیبیہ ہال کی تعمیر کا خرچ امیر حبیب اللہ خان نے اغلباً ڈاکٹر صاحب کی ترغیب و
تحریک پر ہی عطا کیا ہوگا ۔

اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر صاحب کی ملازمت کے دوران امیر حبیب اللہ خان ایک
بار اس کالج میں آیا بھی تھا ۔ جب وہ واپس افغانستان کو جانے لگا تو ڈاکٹر صاحب
کے ایما پر کالج کے طلبہ کے جلو میں اسے ایک پرشکوہ جلوس کی شکل میں ریلوے اسٹیشن
لاہور تک لے جایا گیا[1]

انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اس عرصے کا پرانا اور نیا ریکارڈ جو ڈاکٹر صاحب کی

---

[1] بیان حافظ عبدالمجید مرحوم

پرنسپلی سے متعلق ہے کنگھالنا ابھی باقی ہے۔ اس بات کا بہت امکان ہے کہ اس دور کے ریکارڈ کے مطالعے سے ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کے بارے میں کچھ اور قیمتی مواد جو ہماری نظروں سے ابھی تک اوجھل ہے سامنے آسکے۔ ایک صاحب جن کا نام جناب عطا محمد ملک ہے اور جنہوں نے اپنے مقالے (ڈاکٹوریٹ) کے لیے ڈاکٹر عبدالغنی کا نام موضوع کے طور پر چنا ہے اگر کاوش کریں تو ممکن ہے کہ انجمن حمایتِ اسلام کے اس قدیمی ریکارڈ سے کچھ گرانقدر معلومات منصۂ شہود پر آسکیں۔

ڈاکٹر صاحب کی پرنسپلی کے دور میں اسلامیہ کالج میں ایک صاحب جن کا نام خورشید تھا بطور لیکچرر کام کرتے تھے بعد میں وہ ڈپٹی کمشنر بھی بنے [1] وہ صاحب اگر ابتک زندہ ہوں یا اسی زمانے کا کوئی اور اہم شخص جس کا تعلق اسلامیہ کالج یا انجمن حمایت اسلام سے رہا ہو۔ اگر اتنی لمبی عمر پاتے ہوئے موجود ہو تو اس سے بھی کچھ نہ کچھ معلومات اخذ ہوسکتی ہیں۔

---

[1] بیان رانا ظہور الحق نبیرۂ ڈاکٹر عبدالغنی

ڈاکٹر صاحب در عہدِ امیر حبیب اللہ خان

شہزادہ سردار حبیب اللہ خان ۱۹۰۰ء میں بغیر کسی دِقّت کے سریرآرائے سُلطنت ہوا۔ دِقّت اس لئے نہ ہوئی کہ امیر عبدالرحمان خان کی سخت گیری کی وجہ سے اب ہر سرکش عبدالرحمان خان سے بھی زیادہ اس کی روح سے ہراساں تھا۔

افغانستان کی پہلی لیجلیٹو کونسل

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ امیر حبیب اللہ خان کے عہد کا پہلا کام افغانستان کی پہلی لیجلیٹو کونسل کا قیام تھا۔ سردار نصر اللہ خان کو اس کونسل کا صدر بنایا گیا۔ مجھے اور میرے بڑے بھائی مولانا نجف علی خان کو اسکی رکنیت کا اعزاز ملا۔ میں نے ویسٹ منسٹر لندن کی پارلیمینٹ کے اجلاس دیکھے ہوئے تھے لیکن بغیر کسی مبالغے کے کہنا پڑتا ہے کہ امیر کی اس کونسل کے اجلاس باوجودیکہ امیر کی طرف سے اراکین کو اظہار خیال کی پوری آزادی تھی، اتنی خوش اسلوبی سے ہوتے تھے جتنی کہ ویسٹ منسٹر کی پارلیمینٹ کے . . . .

بعد میں بعض اراکین کے منفی اختلافی محرکات نے امیر کو اتنا بد دل کر دیا کہ اس نے ایک سال گذرنے سے پہلے ہی اسے توڑ دیا۔ [۱]

عزیز ہندی کا بیان ہے کہ "انہی ایام میں بعض معزز ہندوستانی بھی دربار کابل میں تھے جن میں ڈاکٹر عبدالغنی اور ان کے برادر بزرگ مولانا نجف علی اور پروفیسر محمد حسین بی اے علیگ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں دراصل انہی حضرات نے امیر مقتول کی توجہ مجلس شوریٰ کے انعقاد کی طرف مبذول کی تھی۔ مگر افسوس تھوڑے ہی عرصے کے بعد امیر حبیب اللہ خان درباری سازشوں کی وجہ سے اس

۱۔ "اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان"، صفحہ ۲۲۲

مجلس شوریٰ سے سخت بدظن ہو گیا اور اس نے بیک جنبش قلم مجلسِ مذکورہ کو محو کر دیا۔[1]

مجلسِ شرفا کا قیام

مجلسِ قانون (لیجیلیٹو کونسل) کے توڑنے کے بعد امیر نے مجلسِ شرفا قائم کی۔ ڈاکٹر صاحب اور مولانا صاحب اس مجلس کے بھی ممبر بنے۔ اس مجلس کا انعقاد صرف اسی وقت عمل میں لایا جاتا تھا جب امیر کو کوئی نہایت ہی اہم معاملہ درپیش ہوتا۔[2]

تعلیم عمومی کی جدید خطوط پر ترویج و اشاعت

ہندوستان میں ڈاکٹر صاحب کے تین سالہ قیام کے دوران مکتب حبیبیہ کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اس کے طلبہ کی تعداد گھٹتے گھٹتے ۵۰ تک پہنچ چکی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب واپس کابل پہنچے تو امیر نے انہیں اس مدرسے کی حالت بہتر بنانے کا حکم دیا۔ کسی ملک کے دارالخلافے میں صرف ۵۰ طلباء پر مشتمل ایک مدرسے کا وجود وہاں کی تعلیمی حالت پر بلاشبہ ایک بہت بڑی طنز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے سرعت سے کام شروع کیا۔

افغانستان کے عوام چونکہ بالکل جاہل تھے اور وہ انگریزی تعلیم کو بالکل کفر خیال کرتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں کی طرف سے ہر وقت زبردست مخالفت کا خطرہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے متوقع صورتحال پر قابو پانے کے لئے کابل کی ساٹھ بڑی بڑی مسجدوں کا انتخاب کیا اور وہاں کے ائمہ کرام کو پرائمری جماعتوں کی تدریس پر متعین کر دیا اور ان کی اچھی خاصی تنخواہیں مقرر کر دیں۔[3]

حال ہی میں پاکستان میں جو مسجد سکول قائم کئے گئے وہ کم و بیش اسی طرز کے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے آج کے یہ مسجد سکول ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ ابتدائی مدارس کی روح لئے ہوئے ہیں۔

---

[1] زوالِ غازی امان اللہ خان صفحہ ۱۴

[2] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان، صفحہ ۲۲۲

[3] احوال و آثار

ڈاکٹر صاحب تعلیم عمومی کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں لکھتے ہیں "قارئین سے معذرت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ افغان سرزمین میں جدید خطوط پر تعلیم عمومی کی ترویج و اشاعت کے باب میں میں اپنا نام لئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ کسی ملک کے انتظام و انصرام میں تعلیم نہایت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اور مجھے بتانا ہوگا کہ افغانستان میں تعلیم عمومی کے کام کی ابتداء کیسے ہوئی اور اسے ترقی کیسے ملتی چلی گئی۔" [۱]

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے بھائی کے تعاون سے ایسے ۵۰۰ طلبہ کا انتخاب کیا جن میں یہ استعداد تھی کہ وہ ابتدائی جماعتوں سے لیکر ثانوی جماعتوں تک کسی نہ کسی جماعت میں داخل ہوسکیں۔ انہیں مختلف مدرسوں میں منقسم کیا گیا۔ مرکزی مدرسے میں جو مکتبِ حبیبیہ کے نام سے جاری کیا گیا تھا، چار سو طلبہ بھرتی کرکے ثانوی جماعتوں کا اجراء کیا گیا، طلبہ کی جماعت بندی کی گئی۔ طلبہ کو درسی کتب فراہم کی گئیں۔ ہر جماعت کے لئے باقاعدہ نصاب مقرر کیا گیا۔ امتحانات کا ایک منظم اور ٹھوس ادارہ قائم کیا گیا۔ ایسے انسپکٹروں کے تقرر کا اہتمام کیا گیا جن کا کام تمام مدارس کا معائنہ کرنا، ان کی تدریس اور نظم و نسق کی دیکھ بھال کرنا اور اپنی روزمرہ کی کارکردگی کی رپورٹ مولانا نجف علی خان صاحب کی وساطت سے ڈاکٹر صاحب کو پیش کرنا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دارالترجمہ والتالیف کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو بعد میں نادر شاہ کے زمانے تک قائم رہا۔ اس ادارے کا کام تصنیف و تالیف، ترجمہ اور دیگر علمی و ادبی خدمات انجام دینا تھا۔ یہ ادارہ افغانستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے واحد ادارہ تھا۔ جس میں مقامی علماء و فضلاء کے علاوہ چند ہندوستانی گریجویٹ مثلاً محمد حسین جالندھری بی اے، علیگ اور مظفر خان بی اے، اسلامیہ کالج لاہور بھی سرگرم عمل تھے۔

---

[۱] "اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان" صفحہ ۲۲۳

اساتذہ کی تربیت کے لئے ڈاکٹر صاحب نے امیر کے سامنے ایک ٹریننگ کالج کے قیام کی تجویز پیش کی جسے قبولیت مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب نے تمام ملک کے لئے ہمہ گیر تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION)

کا پروگرام امیر کے سامنے رکھا جو اس نے منظور کر لیا۔ اس مقصد کے لئے دونوں بھائیوں نے پورے افغانستان کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے افغانستان کے ۱۳ بڑے بڑے شہروں میں مکتبِ حبیبیہ کی طرز کے ثانوی مدارس قائم کئے۔ مکتب حبیبیہ کو ترقیع دیکر یونیورسٹی میں بدل دیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمانروا کی اجازت سے ملک میں ایک میڈیکل کالج قائم کیا جسکی امداد کے لئے امیر نے معقول گرانٹ منظور کی۔[1]

عبدالمنان بیرم کا کہنا ہے "امیر حبیب اللہ خان شہید کے ۱۸ سالہ دورِ حکومت کا سب سے نمایاں پہلو تعلیم اور فنون (ARTS) سے متعلقہ معاملات و مسائل کا ایک سلسلہ تھا۔

اولین امر جس نے حکومت کی توجہ اپنی طرف کھینچی جدید طرز کے مکاتب اور مدرسے

کھولنا تھا۔ تاکہ افغانستان کی نژادِ نو کو جدید تعلیم سے آشنا کیا جائے۔ تعلیم عمومی اور تربیتِ عوام کو بھی حکومت کے پروگراموں میں شامل کیا گیا۔۔۔۔ آج سے ۷۰ سال قبل کابل میں جدید خطوط پر ایک ثانوی اسکول کھولا گیا جس کا نام مکتب حبیبیہ رکھا گیا اور پھر اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں اس قسم کے دیگر تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔"[2]

کتاب "منارِ علم و جہل" میں مذکور ہے کہ بیسویں صدی کی ابتداء میں جو سب سے پہلا اہم کام کیا گیا وہ تعلیمی اداروں میں جدید علوم اور جدید

---

[1] احوال و آثار صفحہ ۲۰ تا ۲۲ [2] افغان معاصر باب اول و دوم

طریقہ ہائے تدریس کی ترویج کا تھا۔[1]

فضل احمد زرمتی نے لکھا ' انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو اقدامات عمل میں آئے وہ جدید اصولوں پر تعلیم و فنون اور عسکری تربیت کے اجراء کرنے سے تعلق رکھتے تھے[2]

مولانا عبیداللہ سندھی کا بیان ہے۔ کہ ' اگر امیر عبدالرحمن خان کے بعد امیر شہید حبیب اللہ خان بادشاہ نہ بنتا تو افغانستان میں کبھی بھی موجودہ ترقی کا دور جاری نہ رہ سکتا '...... اگر اعلیحضرت امیر حبیب اللہ خان کی پرائیویٹ زندگی سے صرفِ نظر کیا جائے تو ہمیں اسے شاہِ اصلاح پسند کہنا چاہیئے۔[3]

مکتب حبیبیہ اور اسکی مختلف شاخوں نے ڈاکٹر صاحب کی توقعات سے بھی زیادہ کم و بیش ۹ برسوں میں یعنی ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۹ء تک حیران کن **ترقی** دکھائی۔ آج سے تقریباً ۸۰ برس قبل افغانستان جیسے پسماندہ ملک کو جدید تعلیم سے آشنا کرنا ایک ایسی ملی خدمت ہے جسے کسی لحاظ سے بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظام تعلیم نے باقاعدہ ایک ایسی نئی نسل کو جنم دیا جو بیدار مغز حریت پسند اور جمہوریت نواز تھی۔ یہ نظام تعلیم ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۹ء تک افغانستان میں عملاً برپا رہا اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑا دوررس ثابت ہوا۔ ان گراں قدر تعلیمی خدمات کی بنا پر عاصی برادران یعنی ڈاکٹر عبدالغنی صاحب اور مولانا نجف علی خان صاحب عاصی کو اگر کابل میں جدید تعلیم کا بانی قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ افغانستان کے سرسید تھے۔

۱۔ 'The pillar of knowledge and ignorance at Kabul' P 11.

۲۔ 'Welcome to Kabul.'

۳۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگذشت، صفحہ ۷۹ از مولانا عبداللہ انصاری۔

ان دونوں بھائیوں نے جہاں ملت پروری کے جذبے کیساتھ افغان قوم کے لئے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی استعداد یں وقف کر دیں وہاں فرمانروایان افغانستان امیر عبدالرحمٰن خان اور امیر حبیب اللہ خان نے بھی کما حقہ قدردانی کی انہیں اعلےٰ مراتب اور بلند مناصب عطا کئے۔

ڈاکٹر عبدالغنی امیر عبدالرحمٰن خان اور امیر حبیب اللہ خان کے پرائیویٹ انگلش سیکرٹری رہے امیر حبیب اللہ کی مجلس قانون اور مجلس شرفاء کے رکن رہے امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (ناظم اعلےٰ سررشتہ تعلیم) رہے وہ کابل کے چیف میڈیکل آفیسر بھی رہے، نیز دارالترجمہ والتالیف کے مہتمم اعلےٰ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کے ایک چھوٹے بھائی مولوی محمد چراغ مکتب حبیبیہ کے صدر معلم رہے۔

یوں محکمۂ تعلیم (معارف) مکمل طور پر ان تینوں بھائیوں کے سپرد رہا۔ امیر حبیب اللہ خان کو ان بھائیوں پر بے حد اعتماد تھا تعلیم کے میدان میں ان کی ہر پالیسی کو وہ بخوشی قبول کر لیتا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے انہیں پورے اختیارات دے دیتا، مگر بہ سلسلۂ ترقی اور یہ دلفریب بہاریں زیادہ دیر تک جاری نہ رہیں۔ سرکاری افسروں کو ان بھائیوں کی یہ تعمیری سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ انہیں اس نئے نظام تعلیم کے نتائج نظر آ رہے تھے جن میں عوام کی بیداری اور نئی نسل کے اندر خود شناسی کا احساس خاص طور پر نمایاں تھا۔ ابھی ان بدخواہ افسروں کے اندر حسد کی چنگاریاں سلگ ہی رہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب نے امیر موصوف کے سامنے ایک اور اسکیم پیش کر دی، جس کا مقصد تعلیم کی اشاعت اور مزید ترقی کے لئے عوام کی ہمدردی حاصل کرنا تھا۔ اس کے نتیجے میں حاسد افسروں کی کج فہمی اور غلط بینی نے ڈاکٹر صاحب کی اس سکیم کو نہایت غلط رنگ دے دیا۔ انہوں نے ان کیخلاف امیر کے خوب کان بھرے اور اس طرح عاصی برادران اور ان کے ساتھیوں کو امیر کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ [1]

---

[1] احوال و آثار، صفحہ ۲۲، ۲۳

ڈاکٹر صاحب نے افغانستان میں نہ صرف جدید تعلیم کی ترویج واشاعت کی بیش بہا خدمت کی بلکہ انہوں نے وہاں مشروطیت (جمہوریت) لانے کے سلسلے میں گراں قدر کام کیا۔ ان کے یہ دونوں عظیم کام حاسدوں اور سازشیوں کی نظروں میں کھٹکتے تھے، چنانچہ ان کے یہ دونوں کارنامے ان کی گرفتاری کا باعث بنے۔

امیر حبیب اللہ خان کی سیرت:

امیر حبیب اللہ خان عادات و اطوار میں بحیثیت مجموعی ایک شریف النفس انسان تھا۔ شروع میں وہ ایک غیر معمولی ذہانت اور قابل داد یاد داشت کا حامل تھا۔ اسے عکس کشی (Photography) کا بہت شوق تھا اور اس نے اسے بطور شغل اختیار کر رکھا تھا۔ وہ اس فن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور اس میں بڑی مشق کیا کرتا تھا اور بالآخر اسے اس میں اچھی خاصی دسترس حاصل ہو گئی۔ وہ فنون لطیفہ کا بھی بڑا شائق تھا اور مصوری و موسیقی کا ایک اچھا نقاد تھا۔ عمارت سازی، عمارت آرائی اور باغبانی میں بھی وہ بہت ذوق رکھتا تھا۔ اسے دربار آرائی اور درباداری کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ وہ بہت سا وقت دربار کی تزئین و آرائش کی تفصیلات طے کرنے میں صرف کر دیتا۔ وہ خوش لباسی کا بھی دلدادہ تھا اور اپنے گرد و نواح کی سلیقہ مندی سے آرائش کرنے میں بڑا حساس تھا۔

اسکی زبان میں لکنت تھی مگر متواتر مشق سے اس نے بہت حد تک اس بدنی نقص پر قابو پا لیا تھا۔ وہ ایک اچھا شاہسوار بھی تھا۔ وہ ایک باقاعدہ اخبار بین بھی تھا اور افغانستان کا ایک بہترین باخبر انسان تھا۔

عمدہ کھانے پکانا بھی اس کے اشغال میں سے تھا۔

امیر حبیب اللہ خان کا حرم عورتوں سے بھرا رہتا تھا۔ زندگی کے بعد والے حصے میں وہ اپنا زیادہ وقت حرم کی زندگی کی نذر کر دیتا تھا۔

وہ اپنی لاتعداد بیویوں کے لباسوں اور ان کے کاموں کی ترتیب وتقسیم میں کافی دل چسپی لیتا تھا۔ ان بیویوں کو وہ یورپین لباس میں ملبوس کراتا اور وقتاً فوقتاً چاندرات میں ان کے جھرمٹ میں گھوڑ سواری کرنا پسند کرتا تھا۔ حرم کی زندگی میں زیادہ منہمک رہنے کی بناء پر اس کے قوا دیت بتدریج بہت کمزور ہوگئے اور وہ جھنجھلاہٹ کا خوگر ہوگیا تھا۔

حرم میں زیادہ محو رہنے کی بناء پر ریاست کے معاملات کی طرف اسکی توجہ بہت گھٹ گئی تھی اور دارالخلافہ سے دور کے علاقوں کے حکام پر اسکی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور وہ نتیجتاً بدعنوان، بددیانت، غبن کرنے والے اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے بن گئے۔ [1]

سراج الاخبار

ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں کہ امیر حبیب اللہ خان فیشن کا سرگرم محب تھا۔ اس نے یورپ کے کئی باتصویر جریدے دیکھے ہوئے تھے۔ اور وہ متمنی تھا کہ افغانستان میں بھی ایک باتصویر اخبار جاری ہو، جس کے ذریعے فیشنی ماحول میں وہ نہ صرف اپنے آپکو دیکھے بلکہ دوسرے بھی اُسے اس شکوہ میں دیکھیں۔ اسے امیر کی تمکنت سمجھ لیجئے یا بے ضرر تسکین ذات قرار لیجئے۔ اس سے قبل امیر کے گرد ایک طرح کا ایک پر اسرار حلقہ ہوتا تھا۔ ملک کے عوام نے امیر کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ عوام کو یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ دربار میں یا دارالخلافے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ امیر اب شاید یہ چاہنے لگا تھا کہ لوگ اس کی باتوں سے واقف ہوں۔ اور ان کو علم ہو کہ ان کے اپنے ملک میں اور ملک سے باہر کیا واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ پس امیر نے خواہش ظاہر کی کہ میں (عبدالغنی) ایک اخبار اشاعت کے لئے تیار کروں اور اگر

---

[1] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان، صفحہ ۲۲۶

ممکن ہو تو اس اخبار میں تصاویر بھی آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کا ایک نمونہ تیار کر کے امیر کے سامنے پیش کیا، جسے امیر نے منظور کر لیا، مگر اس کے چند دن بعد مجھے بندی خانے جانا پڑا اور میرے اس تیار کیے گئے پرچے کی اشاعت کی نوبت کبھی نہ آسکی۔ اس کے ۳ سال بعد امیر نے اپنی اسی خواہش کا اظہار سردار محمود طرزی کے سامنے کیا، جو کہ اس غرض کے لئے بہترین اور موزوں ترین شخص تھا۔ لہذا سردار محمود طرزی نے سراج الاخبار مدوّن کیا اور اس نے اس کے ادارتی فرائض بڑے ڈھنگ، وقار اور خوش اسلوبی سے نبھائے۔ [1]

مولانا عبید اللہ سندھی اس اخبار کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ

"امیر شہید نے سراج الاخبار جاری کیا، جس کی ادارت کی باگ ڈور چند روز بعد سردار محمود طرزی کے سپرد کی گئی۔ سراج الاخبار کے مطبع میں ہندوستانی اور مصری کام کرتے رہے" [2]

---

[1] 'اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان' صفحہ ۳۲۷

[2] مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت صفحہ ۴۴

باب چہارم

ڈاکٹر صاحب کی تحریکِ مشروطیت (مجلسِ جان نثاراں)

تحریکِ مشروطیت :-

ڈاکٹر محمد عبد الغنی افغانستان میں تحریکِ مشروطیت کے بانی اور سربراہ تھے۔ مشروطیت فارسی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب جمہوریت ہے، مگر یہ جمہوریت اس قسم نہیں ہے جو پاکستان جیسے ملکوں میں متعارف ہے بلکہ یہ اس طرز کی جمہوریت ہے۔ جو برطانیہ جاپان اور سری لنکا وغیرہ ممالک میں مروج ہے یعنی یہ بادشاہیت کی موجودگی میں ایک طرح کی پارلیمانی یا دستوری حکومت ہے۔ جس طرح کی جمہوریت ہمارے ہاں چل رہی ہے۔ اسے ہم ری پبلک (REPUBLIC) کا نام تو دے سکتے ہیں لیکن اسے وہ مفہوم نہیں دے سکتے جو برطانیہ والی جمہوریت کا ہے۔

ڈاکٹر عبد الغنی کے ایک معاصر اور ہم کار میر قاسم کا کہنا ہے کہ پہلے پہل افغانستان کے عوام لفظ مشروطیت یا جمہوریت سے آشنا نہ تھے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک جماعت نے جسکی سرکردگی ڈاکٹر عبد الغنی کر رہے تھے۔ اس اختراع کی بنا ڈالی اور پھر اس تصوّر کو دور دراز تک پھیلا دیا گیا۔ روشن خیال افراد کا یہ گروہ مکتبِ حبیبیہ کابل کے ہندوستانی اساتذہ پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس مکتب کے منتظم اعلیٰ تھے۔

عبد الحی حبیبی کو شدید احساس ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلم اساتذہ جن میں ڈاکٹر عبد الغنی سرِ فہرست ہیں کی خدمات بسلسلہ مشروطیت خواہی اور نفاذِ تعلیم جدید اور تلقینِ افکارِ جدید جو انہوں نے افغانستان میں انجام دیں فراموش نہیں کرنی چاہئیں البتہ ڈاکٹر عبد الغنی کو افغانستان میں مشروطیت کا اولین تصور دہندہ خیال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے کابل میں ورود سے کئی سال پیشتر یہ تصوّر متعارف ہو چکا تھا

بلکہ سید جمال الدین افغانی جیسی شخصیت کے جدید افکار افغانستان سے نکل کر برصغیر ہند ایران اور ترکی میں سرایت کر چکے تھے۔ لیکن یہاں پر ہم پھر اپنے رشتۂ کلام کو ڈاکٹر عبدالغنی کے ہمعصر و ہمکار و یکجا محبوس میر قاسم خان کے اس بیان کے ساتھ منسلک کرتے ہیں کہ "ان دونوں افغانستان میں ایک نہایت مختصر تعداد کے اشخاص کے سوا مشروطیت اور ڈیموکریسی جیسے الفاظ سے کوئی آشنا نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب جیسی روشن فکر و درد مند شخصیت اور ان کی مجلسِ جان نثاران نے اس تصوّر کو بہت پھیلایا۔ اسی بناء پر عبدالحی کے نزدیک بھی یہ گمان اغلب ہے کہ یہ اختراع ڈاکٹر صاحب کے ذہن و فکر کی تخلیق ہے۔[۱]

بہت سے تاریخ نویس اس امر پر متفق ہیں، کہ جدید فکر رکھنے والی افغان سیاسی تحریک مجلسِ جانثاراں ایک غیر افغانی شخص ڈاکٹر محمد عبدالغنی کی بنائی ہوئی تحریک تھی۔ یہ تحریک دراصل تحریک مشروطیت ہی کا دوسرا نام تھا۔ میر غلام محمد غبار نے ذکر کیا ہے کہ مکتبِ حبیبیہ کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں پڑی۔ یہ مدرسہ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ۱۹۰۹ء تک سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ آخر اس مدرسے کے عملے نے شاہی دربار سے اور ہند کے کچھ دانشوروں سے گٹھ جوڑ کر لیا اور اس طرح ایک جماعت تشکیل پائی جس کا نام مجلسِ جان نثاراں رکھا گیا۔ اس پارٹی کے ایک گروپ کا ممتاز لیڈر تاج محمد بلوچ یغمانی اور اس کے چند اہم ممبر جوہر شاہ خاں غوربندی اور میر سیّد قاسم خان یغمانی وغیرہ تھے۔ دوسرے گروپ کے رہنما ڈاکٹر محمد عبدالغنی تھے، اور اس کے سرکردہ اراکین مولانا نجف علی خان، مولوی محمد چراغ (یہ دونوں ڈاکٹر صاحب کے بھائی تھے) اور پروفیسر محمد حسین جالندھری وغیرہ تھے۔ مجلسِ جانثاران بنائی اس لئے گئی تھی تاکہ شخصی اور استبدادی حکومت کی جگہ پر ایک جمہوری حکومت قائم کی جائے اور ملک میں جدید تعلیم اور جدید طرز کی زندگی کو عام کیا جائے۔[۲]

عبدالحی حبیبی کا بیان ہے، کہ ارکِ شاہی (ارگ شاہی) کے سیاسی نظر بند افراد مشروطیت کے تصوّر کو ڈاکٹر عبدالغنی کی تخلیق سمجھتے تھے اور جب مشروطہ

---

[۱] جنبشِ مشروطیت در افغانستان، صفحہ ۵۹

[۲] 'افغانستان در مسیر تاریخ'، صفحہ ۷۱۱

تحریک کے قید شدہ افراد سے یہ امر مطلوب ہوتا تھا کہ وہ آگے آئیں اور اپنا اپنا کردار ادا کریں۔ تو وہ متحدہ طور پر ایک نعرہ لگاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو ڈاکٹر صاحب کے تخلیق کردہ تصوّر کے الفاظ دہرانے کے لئے کہتے تھے۔ ع۱

مجلس جان نثاران کئی گروہوں پر مشتمل تھی، چونکہ مجلس کا ہر رکن اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ ہر دوسرے رکن کی بابت معلومات رکھ سکے۔ لہذا مجلس کا ہر چھوٹا گروہ فقط ان اراکین پر مشتمل تھا، جو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے، جماعت کی ہر چھوٹی شاخ مناسب وقفوں پر اپنا اپنا اجتماع کرتی تھی۔ یہ اجتماع کسی ایک رکن کی رہائش گاہ پر وقوع پذیر ہوتا تھا۔ جب یہ اراکین کسی معاملے پر سوچ بچار کرنے کے لئے آپس ہی اکٹھے ہوتے تھے تو سامنے قرآن مجید رکھ لیتے جس پر ایک تلوار اور ایک قلم ہوتا تھا۔

جب تنظیم جان نثاران ملّت نے فکر جدید رکھنے والے کسی شخص کو تنظیم کا رکن بنانا ہوتا تھا، تو اس کے قابل اعتماد ہونے کی پرکھ کرنے کی غرض سے اسے ایک چھوٹے سے گروپ میں کچھ عرصے تک شامل رکھ کر اسکی اہلیت دیکھی جاتی تھی۔ پھر اسے چھوٹے سے گروپ کی موجودگی میں اس سے قرآن حکیم اور شمشیر پر قسم لی جاتی تھی۔ اور وہ تنظیم کے دستور کے نکات یعنی تنظیم کے مقاصد کو جن کا ذکر آگے آئیگا، قبول کرنے کا اعلان کرتا تھا، ہر چھوٹے گروپ کو جو دس اراکین اور ایک سردار پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور وہ عموماً رات کو تاہم بعض اوقات ایک ہی گروپ یا مختلف گروپوں کے افراد کسی برات یا دیگر تقریب پر بھی جمع ہو کر آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کرتے تھے بعد میں مجلس کے کھلے بندوں بھی اجتماعات ہونے لگے، جن میں نئے افراد سے حلف لیکر مزید رکن سازی کی جاتی تھی۔ ع۲

خود ڈاکٹر صاحب نے اپنی مجلس جانثاراں کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان نے اپنی تخت نشینی کے چار سال بعد ہم تن، ہمہ دماغ اور ہمہ وقت

ع۱ جنبش مشروطیت در افغانستان، صفحہ ۵۵، ۵۹۔

ع۲ جنبش مشروطیت، صفحہ ۵۹

اپنی عیش میں انہماک اور نظم و نسقِ مملکت سے کامل غفلت کو اپنا شعار بنا لیا، حکام ولایات خود مختار ہو گئے۔

احکام مرکزی جو ان کے مفاد کے خلاف ہوتے بالائے طاق رکھ لئے جاتے جب امیر نے میرے اہتمام میں معارف کی ترقی دیکھی تو اس نے تعمیم تعلیم کا ارادہ کر کے مجھے کہا کہ اطراف ملک کے ۱۳ شہروں میں کابل جیسے مدرسے قائم کرو۔ اطراف کے اوضاع نزد یک تعلیم کے مانع تھے اپنے کابل والے پراپیگنڈے کی کامیابی سے دلیر ہو کر میں نے ایک مجلس قائم کی اور اس کا نام مجلسِ جاں نثاراں رکھا۔ منشاء یہ تھا کہ چند قابل اور مخلص اور حکومت کے دلی خیر خواہ اصحاب ملک میں رضا کارانہ تبلیغ کے لئے جمع کئے جائیں تا کہ وہ حکام سے جس طرح بھی ہو تعلیمی احکام کی تعمیل کرائیں۔ اس مجلس کو مخالفین کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے حصولِ کامیابی تک عوام سے مخفی رکھا۔ ماشین خانۂ کابل کے صناعوں کے لئے ہیت العلوم کابل میں رات کی تعلیمی جماعتیں کھلی ہوئی تھیں۔ چونکہ وہاں کے لوگوں کا دماغ فتنہ و فساد کے لئے خاص اہلیت رکھتا ہے اور وہ افترا اور بہتان کو حقیقت کا رنگ دینے میں ید طولےٰ کے مالک ہیں دفتروں کے بڑے افسروں نے جو پہلے ہی سے معارف کے مخالف تھے اپنے افترا کے لئے موزوں زمینہ دیکھ کر میرے خلاف رپورٹ کر دی کہ ڈاکٹر افغانستان کی موجودہ استبدادی حکومت کے استیصال اور حکومتِ آئینی کے قیام کے لئے خفیہ سازش کر رہا ہے، پہلے سے موجود حکومت کو اکھیڑ دیگا۔ اور اگر ضروری ہوا تو خاندان شاہی کے تمام ذکور افراد کو بھی ہلاک کر دے گا، اور نئی آئینی حکومت کا پہلا پریزیڈنٹ خود بنے گا، اور اپنے بھائیوں اور دوسرے ہوا خواہوں کو وزارتیں دے گا[1]۔

یہاں پر ڈاکٹر صاحب کی لکھی ہوئی تمثال فریادِ مینائے مسافر کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] دیباچہ 'فریاد مینائے مسافر'

نہانی رفت پیش خواجۂ ما — مؤدّب دست بستہ گشت گویا

ہزاراں بار قربانیم بہ تو — بصد جاں جاں نثارانیم بہ تو

کُنی گر عفو و جانِ من ببخشی — نمایم عرض امرِ رازِ مخفی

کرم کرد و عطا فرمود خلوت — منافق گفت اے سردارِ دولت

ہمائے کامرانی ہر غلّامت — زخلقت ہر عدو نخچیرِ دامت

حسودت منزلِ مقصودِ غمہا — عدوئت دائم آماج المہا

بلا خواہانِ بدخواہ تو یادا — ہمایوں ہر ہوا خواہِ تو یادا

ہماں بینائے سرخیل اساتید — طیورِ ہر چمن نزدش تلامید

بہ تعلیمِ وفا و صدق مشغول — ندارد جز دعائے خیر معمول

سخن داں نغمہ سنجے با کمالے — ادیب و زیرک و احسن خصالے

گردِ طائراں گردیدۂ او — فدائے ظاہر و پوشیدۂ او

ندانستی زخبثِ ایں پرندہ — نہ مینائیست یل شیرِ درندہ

بفنِّ سحر از ہاروت بالا — بعلمِ سحر از ماروت مانا

نوائے بس غریبے کردہ ایجاد — کہ گردد خاطرِ سرکار زو شاد

طیورِ چند را دادہ ازو یاد — بقدغن ہا کہ از خواجہ نہاں باد

بسا تاکید کردہ بہر اخفاش — بمیرد گفت ہر کس کہ کند فاش

مجالس ساختہ زین رازِ پنہاں — بہ تنظیمش شب و روز است کوشاں

نہادہ نام مجلس جاں نثاراں — بحلفِ سخت باہم بستہ پیماں

من و چندے دگر از خادمانت — بعزمِ حفظِ جان و خانمانت

بہ سوگندِ وفا و رازداری — بہ اقبالِ شہ و از فضلِ باری

بہ بینا خویش را پیوند کردیم — رضائے خود بہ امرش بند کردیم

خیالاتِ دبیر و منشیانش — مقالاتِ ہمہ اربابِ دانش

نباشد سرِّ نظمے زہیچ در ہیچ — بجز از ادّعائے سروری ہیچ

به نیلِ کام ساز و نغمۂ نو | نباشد سر آں جز سحر و جادو
سرورے زاں شور پیدا بغایت | شود جاں مرکزِ آرام و راحت
دل شاہ شادماں گردد ز مینا | بہر نعمت نوا زد ساحرہ را
ز بس مشتاق گردد شاہ زمینا | شود ہر روز پیشش مجلس آرا
بیک باہے سرورش دور گردد | ہمہ فرحت ز دل کافور گردد
نقاہت یابد استیلائے بر جاں | شود مغلوبِ ضعف ہر عصب و شریاں
یکے از دیگرے بیگانہ گردد | قوائے آباد سر ویرانہ گردد
بیارد ساحرہ منشور نادر | کہ بینا مالکِ تاج است و سرور
بہرِ او شود ہر حکم صادر | ولیٔ مملکت مینائے ساحر
چو شاہ بشنود عرضِ زاغِ کفتر | پریشاں خاطرے گشت و مضطر
تبسم کرد و فرمود اے کبوتر | برائے من تو کذّابی و مفتر
پرندے کسے طاقت چہ دارد | ہوس ایں گونہ کے در سر بیارد
چگونہ کس ز مینائے کند بیم | کہ نادار است و بیگانہ در اقلیم
جوابش گفت آں نمام بدکیش | ندانی حیفِ از نیک و بدِ خویش
چو مینا برد بر گنجت تصرّف | بگردد دور دولت رنج و تاسّف
ز حسرت سود خواہد کرد آندم | نہ باور کردن حرفِ صحیحم
پرندے نیست آں نادار و بیکس | مطیعِ وے بزورِ سحر ہر کس
سرِ ہر کس مطیعِ سحرِ آنست | سپاہ و حکم بر گنج و رعیت
شبے مادہ نفر را میہماں کرد | مقالے از چنیں و از چناں سر کرد
بنائے مجلسِ سرّی چو بنہاد | ز زور و قوّت خود ہم نشاں داد
ہماندم ز و پر و بال انساں | بدل حیراں شدیم و جان لرزاں
لباسے چوں عرب زیبِ تنش بود | فضیلت را عمامہ بر سرش بود
بہ لفظِ فارسی نطقے بفرمود | فصاحت با بلاغت سر بسر بود

که ای یارانِ صدیق و وفادار — نترسید از من انسان زنهار
من از نسل فاصان سلیمان — ز لطف و رحمتِ رحمان مسلمان

نمودم جدوجهدے در شبابم — برا اصلاحِ مسلمانانِ عالم
قسی دل مگر بودند کر گوش — بر دنیا و متاعش مست و بیهوش
ز نومیدی شدم دل تنگ و حیران — کشیدم کسوتِ صورئ انسان
شدم مینا و کردم سیرِ دنیا — بکابل آمدم بهر تماشا
در اینجا غیرتِ اسلام دیدم — همه یک ملتِ اسلام دیدم
دلم شد صورتِ انسان پوشم — بجبرِ ملتِ خود باز کوشم
نمودم بهر آن نظم محافل — عدوے دین را سازیم غافل
نهان دارید این حرفِ من از شاه — کنم آنرا بوقتِ خویش آگاه
بکارِ خویش ناگردم نه فائز — بدارم صورتِ مینائے عاجز

شما در سرِ من باشید قائم — مگر آنرا پسند د پادشاهم
بگفت این وقتے خواند انسان — بدن لرزید و شد مینائے حیران
شنید از زاغ گفته شاه بابش — بدین استاد۔ شد هر موئے جانش
بیز سید و بلرزید و لهر موو — بزندانِ قفس مینا رود زود

ترجمہ :- وہ (چغل خور ملّا منہاج) چھپ کر امیر حبیب اللہ خان کے پاس گیا۔ اور اس نے ہاتھ باندھ کر مودبانہ عرض کی۔

اے ہمارے خواجہ! اے ہمارے شہنشاہ! ہم آپ پر ہزار دن بار قربان جائیں اور ہماری سینکڑوں جانیں آپ پر نثار ہوں۔

اگر آپ مجھے معاف کریں۔ اور میری جان بخشش کریں تو میں آپ کو ایک چھپے ہوئے راز کی بابت کچھ بتاؤں۔

امیر افغانستان نے اس پر کرم فرمائی کی اور خلوت کا حکم دیا۔

اب ملّا منہاج نے خلوت بلبسّر آنے پر عرض کی کہ "اے سلطنت کے سردار میری طرح آپ کا ہر غلام آپ کی کرم فرمائی کے سبب سے کامیابی و کامرانی کا ھما پرندہ ہے یعنی بہت خوش بخت ہے۔

مخلوق بس سے آپ کا ہر دشمن آپ کے دام میں یوں شکار ہو رہا ہے جیسے کہ نخچیر۔

آپ کا ہر حاسد غموں کی منزلِ مقصود بنا ہوا ہے اور آپ کا ہر دشمن ہمیشہ غم والم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے یعنی اس کے معاملے میں غم صحیح نشانے پر بیٹھتے ھیں۔

اللہ کرے آپ کا بُرا چاہنے والا مصیبت کو دعوت دینے والا اور پریشانی کی خواہش رکھنے والا بنے اور آپ کا ہر بہتری چاہنے والا خوش نصیب بنے۔

اے امیر! وہی میناؔ (ڈاکٹر عبدالغنی) جو مکتبِ حبیبیہ کے استادوں کا سردار ہے اور ہر باغ کے پرندے جس کے شاگرد ھیں وہ ان ساتھیوں کو وفا اور صدق کی تعلیم دینے میں مشغول رہتا ہے۔

وہ بڑا عالم فاضل ہے اور عمدہ نغمے الاپنے میں کمال قابلیت رکھتا ہے۔ وہ ادیب بھی ہے، سمجھدار بھی ہے اور بڑی اچھی خوخصلت والا شخص ہے۔

پرندوں کے غول اس کے گرویدہ ھیں۔ اور وہ اس کے ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں پر اس کے فداکار ھیں۔

مگر اے شاہ! آپ اس میناؔ پرندے کی خبّاست سے شاید واقف نہیں۔ اسے میناؔ مت کہیں یہ تو پھاڑ ڈالنے والا ایک جانور ہے۔

یہ اپنے فن میں ہاروت سے بھی برتر ہے۔ اور یہ اپنے
جادو کے علم سے ماروت کی مانند ہے۔
اے امیر اس نے ایسی عجیب و غریب نوا ایجاد کر رکھی
ہے کہ جب آپ بادشاہ اسکی بات سنتے ہیں تو آپ بھی اسکی آواز سے
خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔
اس مینا نے اپنی کچھ آوازیں اور گیت دوسرے پرندوں
کو بھی سکھا رکھے ہیں اور جو باتیں آپ امیر سلطنت سے مخفی رکھنے والے
ہیں ان کے افشا کرنے سے انہیں روک دیا ہے۔
مینا نے ان قابلِ اخفا باتوں کو چھپائے رکھنے کے لیئے ان
طیور کو بڑی تاکید کر رکھی ہے۔ اور انہیں سمجھایا ہوا ہے کہ ان میں سے جس
کسی نے راز سے پردہ ہٹایا بس اسکی خیر نہیں اور وہ اپنی جان سے ہاتھ
دھو بیٹھے گا۔
مینا اور دوسرے پرندے اس راز کی باتوں پر سوچ بچار کرنے اور ان
پر تبادلہ خیالات کرنے کے لئے محافل برپا کرتے ہیں۔ اور اپنی اس خفیہ
تنظیم کے سلسلے میں دن رات محنت کرتے ہیں۔
انہوں نے اس تنظیم کا نام مجلس جان نثاراں رکھا
ہوا ہے۔ اور اس مجلس کے بارے میں انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ پکے
عہد و پیمان کر رکھے ہیں۔

میں منہاج الدین اور آپ کے چند اور خدام مثلاً مرزا مستوفی محمد حسین
عبدالحق اور غوند یوال اور محمد عظیم وغیرہ اپنی جان اور آپ کے خاندان کی آن بچانے کے ارادے
اور نیز آپ کا اقبال اور اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم شامل حال رہنے کی بناء پر آپ
سے وفادار اور رازدار رہنے کا جو حلف اٹھا رکھا ہے۔ اس کے خیال سے ہم
نے اپنے آپکو مینا اور اس کی مجلس کے ساتھ جا ملایا اور ہم نے اس پر بظاہر کیا

کہ ھمارا خیال اور رجحان اس کا مطیع ہے۔

ہم نے اس کے اور ماتحت زعماء داد بامد کے خیالات اور مقالات سنے۔ ان کی پیچیدہ باتوں اور خیالات کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بادشاہی کے دعوے دار مینا اپنے مقصد کے حصول کی خاطر نئے نئے نسخے گھڑتا رہتا ہے۔ اور اسکی اس تمام سوچ اور فکر کا راز اور مطلب ساحرانہ تدبیرکاری اور حیلہ سازی کے سوا کچھ اور نہیں۔

اس کے نغموں کا سحر دجادو اس قدر شدید ہے، کہ ان نغموں کو سن کو بہت زیادہ سرور محسوس ہوتا ہے۔ اور جان و بدن میں آرام و راحت پیدا ہوتی ہے۔

میناؔ کی پرکشش باتوں سے آپ امیر دولت بہت شاداں وفرحاں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ عطا و بخشش سے اسے نوازتے رہتے ہیں۔

آپ میناکی دلآویز باتوں کے اتنے مشتاق ھیں، کہ روزانہ اسے اپنے دربار میں بلاتے ہیں اور اسکی باتیں سنتے ھیں۔

مگر چونکہ مینا اندر سے آپ امیر دولت کا مخالف ہے۔

لہذا اس کے نغمے کا سرور ایک مہینے کے اندر ختم ہوجانے والا ہے۔ اور آپ کے دل میں جو مسرت پیدا ہوئی وہ آناً فاناً زائل ہوجانے والی ہے۔

نتیجتاً ایسے نغمے سے کمزوری جان پر غلبہ پاتے لگتی ہے اور بدن کا ہر پٹھا اور نس منعف محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس بنا (ڈاکٹر عبدالغنی) کی سکیم بالآخر ایک فرد کو دوسرے فرد سے بیگانہ کر دینے والی ہے۔ اور دماغ اور دیگر اعصابِ جسمانی کے سرگرم وآباد قواء کو مضمحل و برباد کر دینے والی ہے۔

اس جادوگر مینا نے اپنی مجلس جاں نثاراں کا ایک عجیب و غریب منشور بنا رکھا ہے جسکی روشنی میں یہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ یہ مینا آئندہ تاج دتخت کا مالک بننا چاہتا ہے۔

اعلیحضرت! ایک وقت آنے والا ہے جب اس مینا کی مہر
سے ہر حکم جاری ہوگا کرے گا۔ اور یہ ساحر مینا تمام مملکت کا والی ہوگا۔
جب امیر حبیب اللہ خان نے اس کبوتر نما کوے (منہاج)
کی گذارش سنی تو وہ پریشان اور بے چین سا ہوگیا۔
امیر مسکرایا اور فرمانے لگا کہ اے کبوتر! میرے خیال میں
تو ایک جھوٹا اور افترا پرداز شخص ہے۔
بھلا ایک بےکس پرندے کی کیا مجال ہوسکتی ہے اور اس کے
دماغ میں یہاں کا والی بننے کی خواہش کیونکر آسکتی ہے۔
آدمی ایک ایسے مینا سے بھلا کیونکر خطرہ محسوس کرے جو کہ
نادار بھی ہے اور اس ملک کا باشندہ بھی نہیں ہے
اس بدخصلت چغل خور نے امیر کو جواب دیا آپ اپنے نیک و بد کو
نہیں سمجھ رہے ہیں۔
جب مینا آپ کی دولت (سلطنت) پر قبضہ کرے گا پھر اس وقت کف
افسوس ملنے اور رنج کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔
اس وقت آپ کو میری درست باتیں نہ ماننے پر جو افسوس
و ملال محسوس ہوگا وہ بے سود ہوگا۔
یہ نادار جیسے کسی مینا پرندہ نہیں بلکہ ہر کوئی اس کے جادو
کے زیر اثر اس کا فرمان بردار ہے۔
ہر شخص کا سر اس کے ساحرانہ احکام کے آگے جھکا رہتا ہے
اور دولت کے افسروں اور عوام اس کے احکام کی یوں اطاعت کرتے ہیں جس طرح
کسی بادشاہ کے سپاہی اس کے فرامین کی اطاعت کیا کرتے ہیں۔
ایک رات مینا نے ہم دس آدمیوں کی مہمانی کی اور اس نے
مختلف ملکی مسائل پر گفتگو کی۔

گفتگو کے دوران جب اس نے مجلس جان نثاراں کا ذکر چھیڑا تو اس نے اپنی تنظیم کی قوت وطاقت کی طرف بھی اشارہ کیا۔

اس وقت اس نے بال و پر ہلائے اور اپنے آپ کو نمونے کا ایک انسان ظاہر کیا۔ ہم اسکی گفتگو سُن کر دل ہی دل میں حیران ہوئے اور ہماری روح کانپ اٹھی۔

اُس نے عربی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اور فضیلت کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔

اس نے فارسی زبان میں باتیں کیں اور اسکی باتوں سے فصاحت وبلاغت ٹپک رہی تھی۔

اس نے موجود افراد کو مخاطب ہوکر کہا کہ "اے میرے سچے اور وفادار دوستو! مجھ جیسے انسان سے حراساں نہ ہو۔

میں مینا حضرت سلیمان کے خواص کی نسل میں سے ہوں۔

اور خدائے رحمٰن کے لطف وکرم سے مسلمان ہوں۔

میں اپنی جوانی میں مُسلم اُمہ کی اصلاح کے سلسلے میں سعی اور کوشش کرتا رہا ہوں۔

مگر افسوس کہ ان مسلمانوں میں سے اکثر بیخبر دل تھے اور کانوں سے بہرے تھے۔ اور دنیا اور اس کے ساز وسامان میں پڑ کر مست اور بے خود تھے

ان سے نا امید ہو کر میں تنگ دل اور پریشان ہو گیا۔

بالآخر میں نے انسان سے مینا پرندے کی شکل وصورت اختیار کر لی۔

میں مینا بن کر دنیا کی سیر کے لئے نکل پڑا اور افغانستان کا تماشا کرنے کے لئے میں کابل چلا آیا۔

یہاں پر میں نے اسلام کی غربت کا مشاہدہ کیا اور یہاں کے تمام مسلمانوں کو ایک ملت میں متحد پایا۔

میرے دل نے چاہا کہ میں پھر سے انسان کی شکل اپنا لوں اور اپنی ملتِ اسلامیہ کی بھلائی کے لئے پھر سے کوشش شروع کر دوں۔

میں نے مجلسِ جاں نثاراں کی محفلوں کے انعقاد کا اہتمام اس لئے شروع کیا تاکہ دینِ اسلام کے دشمن کو غافل بنا دیا جائے۔

میری ان باتوں کا شاہ حبیب اللہ خان کو ابھی پتہ نہ چلنے پائے۔ جب مناسب وقت آئیگا تو میں خود اِن باتوں کو اس پر آشکار کر دوں گا۔

جب تک میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتا اس وقت تک میں مسکین مینا کا روپ ہی دھارے رہوں گا۔

تم لوگ میرے بتائے ہوئے راز پر قائم رہنا۔ ویسے بادشاہ کے سامنے میں ان باتوں کو جس انداز میں پیش کرتا ہوں وہ بھی انہیں پسند کرتا ہے۔

مینا جب یہ سب کچھ کہہ بیٹھا اور اس انسان صورت مینا نے پھر آسا گفتگو کی تو مجھ (منہاج) کا بدن کانپ اٹھا اور مینا اپنی بدظنی کی بنا پہ حیوان صفت نظر آنے لگا۔

امیر حبیب اللہ خان جب اس کبوتر نما کوّے کا بیان سن چکا تو غصّے کی شدّت کے سبب سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

امیر نے خوف محسوس کیا اور اس پر کپکپی طاری ہو گئی اور اس نے حکم دیا کہ اس مینا کو بہت جلد جیل میں بند کر دیا جائے۔

لفظ آئینی سے یاد آیا کہ عزیز ہندی نے آئینی حکومت اور عوام کی جہالت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ' یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جتنا کسی ملت میں علم کا چرچا زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی اس ملک کا بیکار عنصر ایک منظم اور آئینی طریق پر ملکی حکومت سے کام مہیا کئے جانے کا مطالبہ کریگا اور اس کے بالمقابل ایک آئینی حکومت بھی ملک کے بیکار طبقے کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھے گی اور مناسب

وسائل و ذرائع مہیا کرنے کی طرف ہمہ تن مصروف رہیگی لیکن جہاں حالت اسکے بالکل ہی برعکس ہو یعنی نہ تو ملک میں علم کے انتشار کے ذرائع ہی موجود ہوں اور نہ حکومت آئینی ہو وہاں قدرتاً ملک کا جاہل اور بیکار طبقہ اپنی گذران کے لئے ضرِ اخلاق اور پُر از معصیت خصائل سوچنے کی طرف طبعاً مائل و راغب ہوگا۔ عہ

مجلس جاں نثاران کے اغراض و مقاصد :۔

(۱) اسلامی اصولوں کی اطاعت کرنا قرآنِ عظیم کی تقدیس کرنا اور تمام اسلامی احکام کو قبول کرنا

(۲) ملی حقوق حاصل کرنے کی متواتر کوشش کرنا اور ملّی حاکمیت اور قوانین کو جمہوری رنگ دینا۔

(۳) عوام کو معاشرتی امور کے سلسلے میں تلقین کرنا اور مذموم عادات کو ترک کرنیکی ترغیب دینا۔

(۴) ملک کے تمام قبائل کے مابین صلح اور افہام و تفہیم کی فضا قائم کرنا

(۵) تعلیم کا عام کرنا لوگوں کی بیداری کا اہتمام کرنا اور مطبوعات کا بندوبست کرنا

(۶) آشتی و تعاون کے ذریعے نہ کہ دہشت خیزی اور استعمالِ اسلحہ کے ذریعے قومی اصلاح کرنا۔

(۷) آزادانہ انتخابات کے ذریعے ملّی مجلس شوریٰ قائم کرنا۔

(۸) سیاسی و ملکی آزادی حاصل کرنا اور دیگر ممالک کے ساتھ سیاسی و اقتصادی روابط بڑھانا۔

نوٹ :۔ ان دنوں حبیب اللہ خان امیر افغانستان اس امر کا پابند تھا کہ حکومت برطانیہ ہند کے سوا کسی اور ملک سے سیاسی روابط نہ رکھے۔ مجلس جاں نثاران اس پابندی کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

(۹) صنعت و حرفت، ذرائع آمد و رفت اور منابع آب و برق وغیرہ کے سلسلے میں پیش رفت دکھانا۔

عہ زوالِ غازی امان اللہ صفحہ ۸۳

نشانِ مجلس جان نثاران

باب پنجم
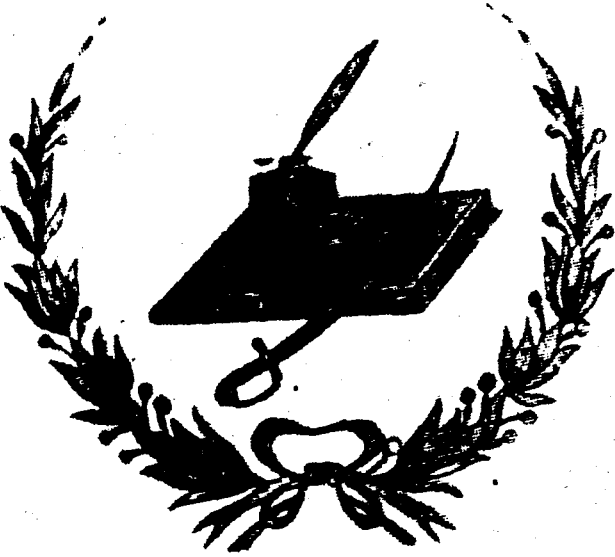
ڈاکٹر صاحب کی گرفتاری و قید

سازشی افراد :-

خود امیر عبدالرحمٰن خان فرمانروائے افغانستان اپنے لوگوں کے سازشی اور جھگڑالو ہونے کا بڑا شاکی اور نالاں تھا۔ اس کی توزک میں مرقوم ہے کہ "بہت سے مواقع پر میرے اپنے لوگوں کی خراب روش سے میرا حوصلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ لوگ آئے دن لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اپنے مخالفوں کے خلاف جھوٹی اطلاعات دیتے رہتے ہیں۔ ان کی اس منفی روش سے میں بہت تنگ آگیا ہوں اور بعض دفعہ تو اس نتیجے پر پہنچنے لگتا ہوں کہ یہ اپنی وحشیانہ حالت کو بدلنے والے نہیں اور ان کی ریشہ دوانیاں ختم ہونی والی نہیں[1]

خود ڈاکٹر صاحب ان حاسدوں اور درباری سازشیوں کی بابت لکھتے ہیں" افغانستان کے لوگوں کا دماغ فتنہ و فساد کے لئے خاص اہلیت رکھتا ہے اور وہ افترار اور بہتان کو حقیقت کا رنگ دینے میں یداولے کے مالک ہیں"[2]

ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقائے کار یعنی مجلس جانثاراں کے اراکین اور عہدیداروں کے خلاف امیر حبیب اللہ خان کے کان بھرنے میں تین اشخاص پیش پیش تھے اور وہ تھے مستوفی الممالک محمد حسین، مُلّا منہاج الدین اور عبدالحق[3]۔

مولانا نجف علیخان عاصی اپنے نغمۂ درد میں منہاج الدین کے کرتوتوں کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

تمیم یدگہر کو بس لعین است   تجاوز کردہ از منہاجِ دین است

---

(1) The life of Amir Addur Rehman edited by Mir Munshi Sultan Mohammad Hindustani.

(2) دیباچہ ٔ فریادِ مینائے مسافر (3) 'مسیر' صفحہ ۱۵ ، ۷ ، جنبش مشروطیت در افغانستان صفحہ ۷۰ اور احوال و آثار مولانا نجف علیخان صفحہ ۲۴

سزائے سخت بد بد ناسزا را | کہ تا عبرت شود اہل دغا را
نہد بر گردن او طوق لعنت | کند آماج تشنیع و تعنّت
سیہ رو کردہ کذّاب شقی را | سوارِ خر کند آں مفتری را
بگردانندش اندر شہر ہر سو | بہ بازار و لبوق و درستہ و کو
زہر برنا و پیر از بامِ خانہ | شود تیر ملامت را نشانہ
بود زنجیر فولادی بپائش | ہجوم لائماں اندر قفائش
بود غوغائے مردم در پِس او | کہ اینک فتنہ انگیزِ سیہ رو

ترجمہ ! ملا منہاج الدین اتنا بد فطرت اور اس قدر زیادہ لعنتی آدمی ہے کہ اپنے قابلِ نفرت کاموں کی بنا پر دین اسلام کے راستے سے بہت زیادہ بھٹکا ہوا ہے منہاج الدین اس قدر قابلِ مذمت ہے کہ وہ سخت سزا کا مستحق ہے تاکہ دوسرے دھوکہ بازوں کو اس سے سبق مل سکے۔

اس کی گردن کے گرد لعنت کا ایک طوق لپٹنا چاہیئے اور اسے نشانۂ طعن و تشنیع بنانا چاہیئے۔

سنگدل کذاب کے منہ کو کالا کرنا چاہیئے اور اس افترا پرداز کو گدھے پر بٹھانا چاہیئے پھر اسے شہر کے چاروں طرف پھرانا چاہیئے لیعنی اسے لے کر بازاروں میں، راستوں میں اور گلیوں میں گشت کرنا چاہیئے۔

یہاں تک کہ وہ گھروں کی چھتوں پر سے ہر بوڑھے اور جوان کی طرف سے پھینکی جانے والی ملامت کا نشانہ بن جائے۔

لوہے کی ایک زنجیر اس کے پاؤں میں ڈالنی چاہیئے اور ٹھٹھا کرنے والے ایک ہجوم کو اس کے پیچھے لگانا چاہیئے۔

اس کے پیچھے شور و غل کرنے والے لوگوں کا ایک شور ہونا چاہیئے۔ اور وہ لوگ یہ کہتے پھریں کہ یہ ہے وہ کالے منہ والا فتنہ انگیز شخص۔

خود ڈاکٹر صاحب نے اپنی منظوم تمثال میں ایسے تفرقہ پردازوں اور جاسوسوں کی بابت یوں

اظہار کیا ہے۔

دلے چندے ز کفتر زاغ حاسد | منافق باطن و در دین فاسد
بہ انواع مکائد حیلہ پرداخت | بنائے تفرقہ در مجلس انداخت
مثال ناصح مشفق ہوا خواہ | حجاب پند بر دامن نہادہ
بدام افتادہ چندے عندلیباں | بایشاں گفت سر خیل حسوداں
کہ اے سروان باغ دین و ملت | بمن وابستہ در سلک اخوت
برنگ فتنہ و تدبیر پنہاں | خلاف مجلس و مینائے ناداں
شنیدم مردم عام اند آگاہ | ز حال جاں نثاران شہنشاہ
یکے گوید کہ شرطہ مراد است | دگر کاں بہر تعلیم جہاد است
کسے سازش برائے بغی گوید | غرض ہر کس دراں عیبے بجوید
نہاں کے ماند ایں راز محافل | دل مینا ست صاف و ہست غافل
نہ ہست آگاہ از جاسوس عیار | نہ زآب و تاب ملک و صنع دربار

ترجمہ :۔ ان حاسد کوؤں نے کبوتروں کا روپ دھار رکھا ہے۔ ان کے باطن تو منافقت سے لبریز ہیں اور یہ دین میں فساد پھیلانے کے درپے ہیں
ان میں سے ایک بد طینت نے طرح طرح کے مکر و فریب سے حیلہ سازی کی اور اس نے مجلس جانثاراں میں تفرقے کی داغ بیل ڈال دی ۔ (اشارہ منہاج کیطرف ہے)
وہ ایک شفیق ناصح کی مانند اپنے آپ کو تنظیم جاں نثاراں کا خیر خواہ ظاہر کرتا ہے اور اس نے پند و نصائح کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔
مجلس جاں نثاراں کے باغ کی چند بلبلیں اس کے فریب کے دام میں پھنس گئیں
ان بلبلوں سے حاسدوں کے اس سردار نے کہا۔
اے دین و ملت کے باغ کے درختان سرو! تم میرے ساتھ اخوت کی رسی سے بندھے ہوئے ہو۔
بہر حال اس نے ایک خفیہ تدبیر اور فتنے کے رنگ میں مجلس جاں نثارانی اور مجھ مینا کے

خلاف ایک مصیبت کھڑی کردی۔

لوگ مجلس جان نثاراں کے احوال کے بارے میں مختلف الرائے ہیں لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ مجلس جان نثاراں سے مراد مشروطہ خواہوں کی تنظیم ہے کوئی اور کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اشاعتِ تعلیم کے لئے جہاد ہے۔ کوئی اور اس جماعت کو حکومت کے خلاف ایک باغیانہ تنظیم سمجھتا ہے۔ الغرض ہر کوئی اس جماعت کی عیب جوئیوں میں مصروف ہے۔

مجلس جان نثاراں کی جو خفیہ نشستیں ہوتی ہیں وہ بھلا خفیہ کیسے رہ سکتی ہیں۔ در حالیکہ اس مجلس میں منہاج جیسے غدار موجود ہوں۔ مجھ مینا کا دل توصاف ہے۔ میں منہاج جیسے افراد کی بدنیتوں سے غافل رہا۔

میں مینا منہاج جیسے جاسوسوں کی منافقت سے آگاہ نہیں رہا اور نیز میں بادشاہ حبیب اللہ خان کے آدابِ دربار اور کرّ وفر سے مرعوب ہوکر خوشامد نہ کرسکا (ترجمہ ختم)

سازشیوں نے امیر کے کان میں یہ بات ڈالی کہ ڈاکٹر عبدالغنی کی ذات حضور کے لئے سخت خطرناک ہے۔ اس نے تعلیمی ترقی کی آڑ میں ایک مضبوط اور منظم جماعت تیار کی ہوئی ہے یہ پارٹی صرف افغانستان تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی شاخیں ہندوستان، ترکی، روس اور ایران تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے سرفروش ساتھیوں نے آپ کے خلاف انقلاب لانے کا مصمم فیصلہ کرلیا ہے اگر اسے مع اس کے ساتھیوں کے فوراً گرفتار نہ کیا گیا۔ اور تختہ دار پر نہ لٹکایا گیا تو سرکار کی حکومت کو سخت خطرہ لاحق ہوجائے گا۔

سازشیوں کا جادو امیر پر اتنی کامیابی سے چلا کہ اس نے اصل معاملہ کی تحقیق کئے بغیر۔ ڈاکٹر صاحب کو مع ان کے بھائیوں اور ساتھیوں کے جیل میں ٹھونس دیا۔ یہ اندوہناک واقعہ مارچ ۱۹۰۹ء کا ہے۔ ان کی جائیدادیں ضبط کرلی گئیں ان کے گھر کا سارا سازو سامان مقفل کرکے سربمہر کردیا گیا ان کی مستورات کو ان کے گھروں میں نظر بند کردیا گیا[1]

---

[1] احوال و آثار۔ صفحہ ۲۴

عزیز ہندی لکھتے ہیں کہ اگر باپ (امیر عبدالرحمن خان) نے جمہور کے سرکردہ سرکش افراد کی گردنوں سے مینار تعمیر کروائے تھے تو بیٹے (امیر حبیب اللہ خان) نے حریت خواہان ملک و ملت کو ہمیشہ کے لیے زندان بلا میں ڈالکر سنت آذری کو پورا کر دکھایا۔

برصغیر ہند کے اخباروں مثلاً زمیندار، اور پیسہ اخبار نے ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کی گرفتاری پر شور مچایا۔ شہ سرخیاں جمائیں۔ اداریے لکھے اور اپیلیں کیں۔ ان کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔

۱۹۱۱ء بمطابق ۱۳۱۲ ق میں ڈاکٹر صاحب نے ارگ شاہی سے برصغیر کے اخباروں کو ایک مضمون لکھ بھیجا کہ اگر امیر حبیب اللہ خان مجلس جان نثاران کو کام کرنے دیتا اور اس پر پابندی عائد نہ کرتا تو آج مینگل قبیلہ کی طرف سے یہ بغاوت رونما نہ ہوتی ....

ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائیوں اور دوسرے ساتھیوں کا عرصہ قید و بند اتنی طوالت اختیار کر گیا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ حضرات دنیا ہی سے اٹھ گئے ہیں۔ دنیا سے اٹھ جانے اور اس لمبی قید بھگتنے میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر صورت میں انسان دنیا میں واپس نہیں آتا جبکہ یہ حضرات جیل میں گیارہ لمبے برس گذار کر ایک طرح کی نئی زندگی کے ساتھ دنیا میں واپس آگئے۔

محبس کے ان ایام میں انہوں نے اپنی روحانی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ کچھ وقت وہ اللہ کو یاد کرنے اور اس کے آگے گڑگڑانے میں گذارتے اور کچھ وقت وہ قرآن پاک حفظ کرنے، قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے و منظوم حبسیات وغیرہ لکھنے میں بسر کر دیتے۔

اضمحلال قوا ر :-

ڈاکٹر صاحب اور ان کی مجلس جان نثاران اسلام و ملت کے آدمیوں کو قید و بند کی اذیت میں ڈالنے کا ایک سبب امیر حبیب اللہ خان کے قوا ر کا اضمحلال بھی تھا بہت زیادہ جنسی انہاک کی وجہ سے امیر موصوف کی جسمانی اور ذہنی قوتیں کافی حد تک ماند پڑ گئی تھیں۔ اور اس کی قوت فیصلہ کی قطعیت میں کمی آچکی تھی۔ جب اس کے سامنے کوئی پیچیدہ مسئلہ لایا جاتا تو وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا اور اس کے دماغی و بدنی

اعصاب مخیف ہوجانے کی وجہ سے وہ جلدی غصہ میں آجاتا تھا یہ سب کچھ اس جنسی بھوک کی وجہ سے تھا۔ اس کی اس جنسی بھوک کا ذکر مولانا عبیداللہ سندھی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اس کے ہاں ۳۰۰ تین سو نکاح بستہ عورتیں تھیں، ہر ڈاکٹر اسے رات کے وقت انجیکشن لگاتے تو اس کے اندر خواہش پیدا ہوتی اور امیر صاحب ایک عورت کو بلاتے تھے ...... پھر تو یہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ شہری شرفار کی خوبصورت بہو بیٹیوں کی تلاش کے لیے دلالہ عورتوں کو بھیجا جاتا ہے .... بعض عفت مآب لڑکیوں نے تو خودکشی کرلی [1]

ڈاکٹر صاحب کے خلاف حاسد اور بدخواہ ہر وقت امیر موصوف کے کان بھرنے لگے وہی امیر حبیب اللہ جس نے عذرخواہی کا مکتوب بھجوا کر ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ افغانستان بلا بھیجا تھا اور پھر ڈاکٹر صاحب نے بھی آکر چند سالوں کے اندر بڑے خلوص اور محنت سے ملک سے تعلیمی پسماندگی کو کافی حد تک دور کر دیا تھا جاسوسوں اور سازشیوں کے فریب میں آگیا اور ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شاید بادلِ ناخواستہ زندان میں بھیجنے پر مجبور ہو گیا اگر اس کی قوتِ فیصلہ قوی ہوتی تو ان فریبیوں کی باتوں میں نہ آتا اور ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو بلا تحقیق وتفتیش نظر بند نہ کرتا۔

حیرت ہے کہ امیر نے مجلس جاں نثارانِ اسلام کے سربراہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے کچھ ہمکاروں کو صرف قید کی سزا دی جبکہ ان کے چند افغان ہمکاروں کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ اس کا جو سبب سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ امیر شاید ان افغان زعمار کے رسوخ اور قوت سے ڈرتا تھا (امیر عبدالرحمٰن خان نے بھی تو ان سرکشوں کو تہ تیغ کیا تھا جو اس کی پریشانی کا باعث بن سکتے تھے) ڈاکٹر صاحب اور مجلس کے چند دیگر

---

[1] کابل میں سات سال صفحہ ۱۷۶ از مولانا عبیداللہ سندھی

ہندی اراکین کو اس نے صرف قید کی سزا دینے پر شاید اس لئے اکتفا کیا تھا کہ اس کے خیال میں باہر سے آئے ہوئے یہ مسافر لوگ اس کے لئے زیادہ دردسری کا باعث نہیں بن سکتے تھے۔

اس نے یہ خیال کیا کہ شاید یہ لوگ بے گناہ ہوں (جس طرح جامہ تلاشی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب بے گناہ پائے گئے تھے) اسے اپنے فتنہ پرور لوگوں اور ڈاکٹر صاحب کے مخالفوں کی نیت پر بھی تو پورا بھروسہ نہیں تھا اور وہ ان کی دون فطری سے آگاہ تھا اسی لئے تو جب ملا منہاج الدین نے مجلس جان نثاراں کے تمام کارکنوں کی ایک طویل فہرست امیر کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی کہا کہ یہ تمام افراد پھانسی دیئے جانے کے قابل ہیں تو اس پر امیر آگ بگولا ہو گیا اور بولا۔ اے منہاج! اگر میں اس فہرست میں مندرج تمام لوگوں کو تمہاری خواہش کے مطابق قتل کر ڈالوں تو گویا میں نے ایک جہاں کو قتل کر ڈالا، یہ کہہ کر اس نے فہرست کا وہ تمام پلندا جلتی آگ میں پھینک دیا۔[1]

مقتول و محبوس افراد:۔ مارچ ۱۹۰۹ء میں مجلس جان نثاراں کے جو افراد گرفتار کئے گئے انمیں سے کچھ کو توپ سے اڑا دیا گیا اور کچھ کو محبوس کر دیا گیا اور کچھ کو آزاد کر دیا گیا۔ روزنامہ پیسہ اخبار کی ۱۹ر مئی ۱۹۰۹ء والی اشاعت میں کابل کی سازش کے زیر عنوان یہ خبر شائع ہوئی:۔

"...... ملزمان سازش کی تحقیقات کے لئے ایک خاص عدالت قائم ہوئی ہے جس میں سنی شیعہ اور ہندوؤں کے قائمقام ہیں اور دو ملا بھی ہیں جن کو فقہ میں کامل دسترس حاصل ہے چنانچہ اس عدالت نے محمد حسین، محمد اعظم خان اور سردار عبد الغیاث خان کو مجرم قرار دیا اور وہ توپ سے اڑا دیئے گئے۔ ڈاکٹر عبد الغنی اور ان کے دونوں ساتھیوں کا کچھ ذکر نہیں وہ حضرات جن کو مار دیا گیا۔ یہ ہیں۔

(۱) لعل محمد خان کابلی (مصاحب) ولد جان محمد جان

---

[1] 'مسیر' صفحہ ۱۸۷

یہ جلال آباد کا سابق خزانچی تھا۔ اسے چند درباریوں کی شرارت پر تین اور ساتھیوں کے کے ہمراہ موت کی سزا دی گئی (بحوالہ حبیبی و میر قاسم)

(ii) محمد عثمان خان ولد محمد سرور خان پروانی۔ تفصیل آگے نمبر ۱۷ میں دیکھئے۔

(iii) جوہر شاہ خان غوربندی۔ امیر حبیب اللہ خان نے اسے ایک بار نمک حرام کہا۔ اس نے جواب میں کہا "ہم نے افغانستان کے غریب لوگوں کا نمک کھایا ہے" پس ہم آخر تک ان کے وفادار رہے ہیں اور ازرہِ وفا ہم اپنی جانیں دینے میں بھی نہیں ہچکچائیں گے۔

(iv) محمد ایوب خان ولد تاج محمد خان پوپلزئی۔ محمد ایوب اور محمد عثمان خان بھاگ کر ہند پہنچ گئے اور ہند کے اخباروں میں انہوں نے مشروطہ خواہوں کے متعلق بیان چھپوایا۔

(v) ملا محمد سرور ولد مولوی احمد جان خان الکوزئی۔ وہ مکتبہ حبیبیہ کا ایک معلم تھا اسے جب قتل کیا جانے لگا تو اس نے ایک قلم دوات منگوائی اور ذیل کا شعر لکھا۔

ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر

دورۂ مشروطہ اول منزل است

(ہم اپنی جائیداد، جان اور سر قربان کرنے کے لیے تیار رہیں اور مشروطیت ہماری پہلی منزل ہے)

(vi) عبدالقیوم خان الکوزئی۔ یہ گمرک کے لیے مامور کیا گیا تھا اسے کابل میں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

اب ذیل میں ان اراکینِ مجلس کا تذکرہ ہے جنہیں محبوس کیا گیا۔

(i) غلام محمد خان میمنگی

(ii) تاج محمد خان لغمانی ولد علی محمد خان بلوچ

(iii) مرزا محمد حسین کابلی۔ اس کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا

(iv) مرزا عبدالرزاق کابلی

(v) میر زمان الدین بدخشانی

(vii) محمد انور بسمل ۔ یہ مکتبہ حبیبیہ کا ایک پرانا نامور طالب علم تھا۔ وہ ایک عالم، ادیب اور شاعر تھا۔ مکتبہ حبیبیہ میں تدریس کے فرائض بھی ادا کرتا رہا ۔ مولوی محمد حسین جالندھری نے لکھا "چونکہ امان اللہ خان مشروطہ خواہوں/مجلس جان نثاران کے اراکین کو اصلاحات خواہ خیال کرتا تھا اس لیے اس نے ہم سب کو قید سے رہا کر دیا مگر محمد انور بسمل کو اس کے بھائی اختر جان کے کسی قصور کی بنا پر رہا نہ کیا ۔ بعد میں اس نے اسے بھی میری درخواست پر رہا کر دیا ۔

(viii) احمد قلی خان قزلباش ۔

(viiii) کرنل عبدالوہاب خان

(x) نظام الدین خان ارغوندیوال

(xi) قاضی عبدالحق خان سلیمانی خیل ارغوندیوال

یہ امان اللہ خان کے دور میں مکتبہ حبیبیہ میں دینیات کا مدرس تھا یہ ایک فاضل آدمی تھا اور اس نے ابتدائی جماعتوں کے لیے دینیات کی نصابی کتب لکھیں ۔

(بحوالہ میر قاسم)

(xii) میر سید قاسم خان لغمانی ۔ یہ پہلے پہل مولوی واصف کے ساتھ مل کر سراج الاخبار کی تدوین کرتا تھا۔ اس کا والد سید غلام محمد لغمانی وقت کا ایک جید عالم تھا جو امیر عبدالرحمن خان کا اتالیق بھی رہا ۔ میر سید قاسم مدرسہ حبیبیہ کابل میں تدریسی فرائض انجام دیتا رہا۔ پھر وہ جدید افکار رکھنے والے افراد کے گروہ سے متعارف ہوا جس کا سربراہ مولوی واصف تھا اسے چند برس تک شیرپور میں مقید رکھا گیا ۔ بعد میں امیر حبیب اللہ خان نے اسے اس کے باپ کی خدمات کو ملحوظ رکھ کر رہا کرایا (بحوالہ مقالہ از میر قاسم) امیر امان اللہ خان کے دور میں وہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک 'امان افغان' کا مدیر رہا۔ پھر اسے شاہی دربار میں میر منشی کے منصب جلیلہ پر فائز کیا گیا اور یہ منصب اس کے پاس ۱۹۲۷ء تک رہا ۔

(xiii) حافظ عبدالقیوم

(xiv) محمد ابراہیم کابلی

(xv) عبدالماجد خان

(xvi) عبدالرحمن قندھاری ۔ یہ مولوی محمد سرور خان کا بھائی تھا ۔ یہ حبس میں ہی قفس عنصری سے رہائی پا گیا (بحوالہ "میسر" صفحہ ۱۹)

(xvii) شیر علی خان بارک زئی ۔ یہ سیستان کے ایک خان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا ۔ اسے شیرپور کے قید خانے میں رکھا گیا یہ اس وقت رہا ہوا جب عہد امانی شروع ہوا (میسر صفحہ ۱۹)

(xviii) حاجی محمد اکبر یوسف زئی ۔ یہ ایک دانشور تھا ۔ مشروطہ تحریک میں حصہ لینے کی بنا پر نظر بند کر دیا گیا ۔ مگر جلد رہا کر دیا گیا ۔

(xix) اخوندزادہ محمد اکبر اسحاق زئی قندھاری ۔ اسے بھی شیرپور میں مقید رکھا گیا اور امیر حبیب اللہ کے دور کے خاتمے تک وہیں رہا ۔ یہ بھی ایک فاضل شخص تھا

(xx) جلال الدین قندھاری ۔

میر غلام محمد غبار نے اسے جلال الدین نام دیا ہے جبکہ حبیبی کے نزدیک اسکا نام عبدالجلال تھا

(xxi) کاکا سید احمد خان قندھاری

پروفیسر مولوی محمد حسین نے اسے بہت گرمجوشی سے یاد کیا ہے اور اسے قید کے ایام کا ایک اچھا ندیم کہا ہے ۔ قید کے دوران یہ ناخواندہ قیدیوں کو پڑھاتا تھا ۔

(انقلاب افغانستان صفحہ ۱۹ از مولوی محمد حسین)

(xxii) سردار عبدالرحمٰن خان و سردار عبدالحبیب خان ۔

یہ دونوں سردار عبدالوہاب خان کے بیٹے تھے انہوں نے کچھ عرصہ بیرون ملک گذارا تھا واپس آکر یہ تحریک مشروطیت میں شامل ہو گئے ۔

(xxiii) محمد رسول خان محمد زئی (بحوالہ میسر، صفحہ ۱۹)

(xxiv) امین الدین خان ۔ یہ تحریک مشروطیت کے افغان گروہ اور ہندی گروہ کے درمیان ارتباط کا ذریعہ بنا رہا ۔

(xxv) مولوی محمد مظفر خان مروت ۔ مروت اس قبیلے کو کہتے ہیں جو بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان

کے علاقے میں مکین ہے۔ برطانوی ہند سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولوی محمد مظفر خان
مدرسہ حبیبیہ کابل میں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے لئے متعین ہوا۔ یہ وہاں ریاضی اور
جغرافیہ پڑھاتا تھا۔ پھر یہ مشروطہ خواہوں کے ہندی گروپ یعنی مجلس جان نثاراں
سے منسلک ہو گیا یہ شیرپور میں محبوس کیا گیا اور چند سالوں کے بعد وہیں وفات پا گیا
(جنبش، صفحہ ۴۰)

(۷i × ×) ڈاکٹر عبدالغنی

(۷ii × ×) مولانا نجف علی خان

(۷iii × ×) مولوی محمد چراغ

ان بھائیوں کا یہاں پر تفصیلی تذکرہ اس لئے نہیں کیا جا رہا کیونکہ ایک تو اس کتاب میں
جا بجا ان کا تذکرہ ہے دوم ڈاکٹر عبدالغنی کے لواحقین کے موضوع کے تحت کچھ
آگے ان سب کا ذکر کر دیا گیا ہے نیز کتاب "احوال و آثار" مولانا نجف علی خان میں
ان کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے

(× i × ×) مولوی محمد حسین جالندھری۔ پروفیسر مولوی محمد حسین جالندھری کو
بھی مجلس جان نثاراں میں سرگرم شرکت کرنے کی بنا پر ارگ شاہی میں محبوس کیا گیا جہاں
وہ اس وقت تک نظربند رہے جب تک امیر حبیب اللہ خان کا دور دورہ رہا۔ انہیں
انگریزی، اردو، فارسی اور عربی پر دسترس حاصل تھی۔ یہ مکتب حبیبیہ کی تاسیس
کے بعد ۱۹۰۷ء میں کابل آئے تھے۔ اور اس مکتب میں انہوں نے جغرافیہ اور تاریخ
کے مدرس کے طور پر کام شروع کیا۔ یہاں یہ مشروطہ تحریک (مجلس جان نثاراں)
کے ایک فعال رکن بن گئے۔ ۲۶ برس کی عمر میں یہ ۱۹۰۹ء میں ارگ شاہی میں مقید ہوئے
اور انہیں اس وقت رہائی ملی جب امان اللہ خان سریر آرائے سلطنت ہوا۔
اپنی نظربندی کے دوران انہوں نے نہ صرف قرآن پاک زبانی یاد کیا بلکہ تفسیر و حدیث
کا بھی انہماک سے مطالعہ کیا۔ چونکہ انہوں نے علی گڑھ کالج میں اپنے قیام کے دوران
مضمون عربی کو اچھی طرح سیکھا ہوا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اسلامی علوم کے اکتساب میں

اپنی توجہ کو مبذول رکھا جب یہ ارگ سے رہا کر دیئے گئے۔ تو یہ امیر امان اللہ خان کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ بعد میں انہیں ابتدائی تعلیم کے مدیر کے طور پر مامور کیا گیا جب افغانستان کی سلطنت بچہ سقہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ تو پروفیسر صاحب نے اخبار "حبیب الاسلام" کی ادارت سنبھالی اور اس میں وہ امیر امان اللہ خان کی اختیار کی گئی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ افغانستان سے اپنے وطن ہند کو بھاگ آئے۔

جب سردار نادر خان نے اقتدار سنبھالا تو پروفیسر محمد حسین نے اپنی کتاب "انقلاب افغانستان" کو اپنے شہر جالندھر سے اردو میں شائع کیا۔ یہ کتاب نادر شاہ کی تعریفوں سے لبریز ہے اور اس میں جابجا امیر امان اللہ خان کی پالیسیوں کو نشانہ تنقید بنایا گیا ہے۔ اس میں افغانستان کی بعض دیگر اہم شخصیتوں پر بھی نکتہ چینی کی گئی ہے اس کتاب میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں اس میں جانب داری برتی گئی ہے۔ تاہم اس میں افغانستان کے ۲۵ سالہ طویل دَور کے حالات و واقعات سے متعلق وافر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب متجسس مورخوں کے لئے ایک بہت مفید ذریعہ ہے۔ مولوی محمد حسین جالندھری بسیار نویس تھے۔ انہوں نے فارسی، اردو، انگریزی اور پشتو زبانوں میں ۷۵ کتب لکھ ڈالیں۔ ان میں سے ۱۳ کتب افغانستان کی وزارت معارف کی نصابی کتب تھیں۔ باقی کتابوں میں سے ۱۸ امیر امان اللہ خان کے سامنے پیش کی گئی تھیں پانچ کتابوں کے تراجم کئے گئے یا دارالترجمہ و اتالیف کے لئے لکھی گئیں جبکہ باقی میں سے چند ہندوستان میں شائع کی گئیں۔ انہوں نے ایک جریدہ بھی نکالا۔ جس میں انکا فارسی ناول "جہادِ اکبر" بھی اقساط میں چھپتا رہا۔ اسمیں کچھ ایسی تصاویر بھی آتی رہیں جن میں افغانوں اور انگریزوں کے مابین پہلی جنگ کے بعض ایسے مناظر پیش کئے گئے تھے جو نہ صرف جذبہ حب الوطنی کو تقویت دینے والے تھے بلکہ ان سے افغانوں کے جذبۂ جہاد کی عکاسی ہوتی تھی یہ افغانستان میں چھپنے والا پہلا فارسی ناول تھا بہرحال ان سے کچھ حد تک ابن الوقتی سرزد ہونے کے باوجود افغانستان کے تعلیمی میدان

میں جو کام انہوں نے انجام دیئے اور مشروطہ تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے انہیں جو مسلسل گیارہ سال درد و کرب جھیلنا پڑا وہ ناقابلِ فراموش ہے [۱]

خود پروفیسر محمد حسین صاحب نے لکھا ہے "کابل میں مجلس جاں نثاراں کا ہندوستانی گروپ جو مشروطہ خواہوں کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا انڈین نیشنل کانگریس کے کارکنوں کے تتبع میں اپنے ملک کا بنا ہوا لباس پہنتا تھا ....

ڈاکٹر عبدالغنی کی بنائی مجلس جان نثاراں اپنے سامنے ایک اچھا دستورالعمل رکھتی تھی ۔ اس کی پالیسی امن جویانہ اور خوشحالی آور تھی ۔جب ۱۹۱۱ء میں منگل قبیلے نے والئ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور حکومت نے جنرل سردار نادر خان کو اس بغاوت کے فرد کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے ارگ شاہی سے افسوس کناں ایک بیان برصغیر کے اخباروں کو بھیجا کہ اگر امیر حبیب اللہ خان مجلس جانِ نثاراں کو آزادی سے اپنا کام کرنے دیتا تو آج اس بغاوت کے سر اٹھانے کی نوبت نہ آتی کیونکہ عوام ان اصلاحات اور اسلامی اصولوں کے نفاذ سے جو مجلس کے منشور کا ایک حصہ تھے مطمئن اور شاداں و فرحاں ہوتے [۲]

اوپر انڈین نیشنل کانگریس کا ذکر آیا تو معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ معرض وجود میں آچکی ہوتی تو اغلب تھا کہ مجلس جان نثاراں اور مسلم لیگ کے درمیان باہمی تعاون و اشتراک عمل رد پذیر ہوتا ۔ کیونکہ ان دونوں پارٹیوں کے نصب العین میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔

اب ذیل میں مجلس کے ان اراکین کے اسماء لکھے جا رہے ہیں جن کو فرمانروا نے معافی دے دی اور وہ بندی خانے سے رہا کر دیئے گئے ۔

---

[۱] جنبشِ مشروطیت ، صفحہ ۶۹

[۲] انقلابِ افغانستان ۔

(i) مولوی غلام محی الدین افغان ۔ یہ بھی مدرسہ حبیبیہ میں درس دیتا رہا تھا۔ اس کا خانوادہ پشاور کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہندوستان کے درسی اداروں سے تعلیم پائی تھی اور ۱۹۰۵ء میں یہ کابل کو دوبارہ آیا اور سرائے پشاوریاں میں شادی کی بندھنوں میں آزاد زندگی گذارتا رہا اس کے رفقاء سرائے میں اس کے پاس آ جمع ہوتے اور علمی و سیاسی مسائل پر گفتگو کرتے (بحوالہ مقالہ از میر قاسم) مولوی غلام محی الدین سراج الاخبار کے لکھنے والوں میں سے ایک تھا اور پشتو میں شاعری کرتا تھا۔ (بحوالہ جنبش مشروطیت صفحہ ۳۰)

مولوی افغان کو تحریک مشروطیت کے ساتھ منسلک ہونے کی بنا پر گرفتار کیا گیا مگر پھر اسے جلد آزاد کر دیا گیا اور اسے دارالتربیت اساتذہ کا پرنسپل مامور کیا گیا (بحوالہ انقلاب افغانستان)

مولوی غلام محی الدین خان افغانی نے معرکۂ مذہب و سائنس کا فارسی میں ترجمہ کیا یاد رہے کہ مولانا ظفر علی خان مدیر روزنامہ زمیندار نے اسی کتاب معرکہ مذہب و سائنس کو اردو میں ڈھالا۔

(ii) حاجی عبدالعزیز خان المعروف بہ لنگر ضامن ۔

(iii) محمد اسلم خان ، انچارج محکمۂ شکار ۔

(iv) صاحبزادہ عبداللہ خان مجاہد

اب ذیل میں حکومت کے ان جاسوسوں کے نام اور کوائف وغیرہ ہیں جو ظاہر یہ کرتے تھے کہ وہ تحریک مشروطیت کے ممبر ہیں مگر حقیقت میں وہ سرکاری جاسوس اور مخبر تھے ان بدبختوں کو شاہی دربار کی طرف سے مفوض کیا گیا تھا اور یہ مشروطہ خواہوں کے خفیہ اقدامات کی اطلاع امیر سلطنت تک پہنچاتے تھے ۔ وہ شیطان صفت انسان یہ تھے ۔

(i) ملا منہاج الدین :۔ یہ سردار محمد کبیر خان کا استاد تھا ۔ پروفیسر مولوی محمد حسین جالندھری رقمطراز ہیں ۔ کہ امیر حبیب اللہ خان نے ملا منہاج الدین کو کہا کہ اگر

میں ان تمام اراکین مجلس جان نثاران ملت کو مار دوں جو تمہاری طرف سے پیش کی گئی فہرست میں شامل ہیں تو ان سب کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ چنانچہ امیر نے وہ تمام فہرست اور کاغذات جن میں مجلس کے اراکین کی سرگرمیوں کی تفصیلات تھیں آگ میں پھینک دیئے اور منہاج الدین کی طرف رخ کرکے بولا کہ اگر ان تمام افراد کو تہ تیغ کر ڈالا گیا تو گویا ایک جہاں کو برباد کر ڈالا گیا [1]

ملا منہاج جو قبیلہ شنواری سے تعلق رکھتا تھا جلال آباد کے مشرقی علاقے میں سکونت پذیر تھا اور دربار شاہی کے شاہزادوں کا اتالیق تھا۔ چالاکیوں اور ابن الوقتی کے ہتھکنڈوں سے اس کی سابقہ پوزیشن امیر امان اللہ خان کے عہد میں بھی بحال رہی۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ مشروطہ خواہ اب اسے شدید حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے [2]

اس نے امیر امان اللہ خان ہی کے عہد میں رسالہ " ستارۂ افغان " میں بھی بحیثیت مدیر کام کرنا شروع کیا مگر مجلس جان نثاران کے سربراہ ڈاکٹر عبدالغنی کے ایما پر جنہیں رہا ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے اس وقت کے وزیر معارف محمد سلیمان خان نے اسے اس کی ادارت سے ہٹا دیا۔

(ii) عبدالحق ارغوندیوال :- یہ بھی امیر حبیب اللہ خان کی طرف سے جاسوسی کے فرائض کی انجام دہی کے لئے مامور تھا [3]

عبدالحی حبیبی کا کہنا ہے کہ اسے میر قاسم ہی کے ذریعے ان جاسوسوں کی بابت علم ہوا اس کے سوا اس کے پاس کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ یہ قابل مذمت عبدالحق ارغوندیوال اس قابل ستائش عبدالحق ارغوندیوال سے مختلف تھا جو مشروطہ خواہوں کے ہمراہ قید جھیلتا رہا اور جو مکتب حبیبیہ میں اسلامیات کا مدرس تھا۔

---

[1] " مسیر " صفحہ ۷۱۸ از میر غلام محمد غبار

[2] جنبش مشروطیت در افغانستان صفحہ ۷۰ از حبیبی

[3] جنبش مشروطیت در افغانستان صفحہ ۷۰ از حبیبی

(iii) محمد عظیم :۔ یہ شخص ٹیکنالوجی کے فوجی کالج میں فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ فن جاسوسی میں بڑی مہارت رکھتا تھا اور اسی بناء پر یہ اونچے منصب پر پہنچ گیا۔ اسے امیر امان اللہ خان کے دور میں بھی بلند مرتبہ عطا ہوا۔ اسے اسلحہ سازی کا چیف افسر مقرر کیا گیا۔ خرید اسلحہ کے سلسلے میں یورپین ممالک مثلاً اٹلی اور جرمنی کیساتھ اس کا اچھا خاصا ربط تھا۔ جرمنی کے ایک جریدے " آزادیٔ مشرق " میں اس کی اور چند درانغانوں کی تصاویر چھپتی رہیں [1]

---

[1] " جنبش مشروطیت " صفحہ ۱۷

باب ششم

ڈاکٹر صاحب کی گرفتاری پر

برّصغیر کے اخبارات میں ہلچل

ڈاکٹر عبدالغنی اور ان کے بھائیوں اور رفقائے کار کی گرفتاری نے برصغیر پاک و ہند کے اخباروں مثلاً زمیندار اور پیسہ اخبار میں ایک ہلچل پیدا کردی۔ امیر حبیب اللہ کے اس اقدام کی مذمت کی گئی۔ پرزور اداریے لکھے گئے اور عالی برادران کی رہائی کے لئے اپیلیں کی گئیں۔ مگر امیر پر یہ آوازیں بالکل بے اثر ثابت ہوئیں اس طرح ان غریب الوطنوں کا معاملہ لمبے سالوں تک طاق نسیان میں رکھ دیا گیا تا آنکہ امیر حبیب اللہ خان کے قتل ہو جانے پر اس کا بیٹا امان اللہ خان تخت نشین ہوا، اور اس نے ان بھائیوں اور ان کے ساتھیوں کو اپریل ۱۹۱۹ء میں رہا کیا۔

ہم ذیل میں روزنامہ "پیسہ اخبار" میں مختلف وقتوں کی شائع شدہ متعلقہ خبروں اور اپیلوں میں سے چند کو نقل کر رہے ہیں۔

روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور

۲۴ مارچ ۱۹۰۹ء

ہز مجسٹی امیر کے خلاف سازش کی افواہ

نامہ نگار پشاور کے حوالے سے افغانستان کے متعلق ایک سنسنی خیز انکشاف اور افواہ ہے نامہ نگار مذکور کا کہنا ہے کہ ہز مجسٹی امیر آج کل جلال آباد میں تشریف فرما ہیں۔

ان کے کیمپ میں بہت جوش و اضطراب پھیلا ہوا ہے کیونکہ ہز میجسٹی ان کے ولیعہد سردار عنایت اللہ خان اور دیگر اراکین خاندان شاہی کو ہلاک کرنے کے بارے میں سازش طشت از بام ہوئی ہے۔ کابل اور جلال آباد میں بہت سے آدمی گرفتار کیے گئے ہیں اور دونوں مقامات میں فوجی احتیاط کی گئی ہے۔ ہز میجسٹی امیر جنوری میں جلال آباد روانہ ہونے کے وقت سردار عنایت اللہ کو اپنے قائم مقام کے طور پر کابل چھوڑ آئے تھے۔ افواہ ہے کہ بی بی حلیمہ (بیوہ امیر عبدالرحمان خان) سازش مذکور میں شریک ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ہز میجسٹی ہر طرح اس سازش کے استیصال کے قابل ثابت ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

۲۵ - مارچ ۱۹۰۹ء

افغانستان میں ہولناک سازش

پائینیر نے ایک نہایت تشویش انگیز افواہ اس مضمون کی شائع کی ہے کہ ایک پنجابی گریجویٹ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب جو سررشتہ تعلیم افغانستان کے ڈائریکٹر ہیں۔ سازش کے شبہ میں گرفتار کیے گئے ہیں۔ مجھے امید نہیں کہ ڈاکٹر موصوف کے رتبے کا کوئی اعلےٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص اس رکیک سازش میں شریک ہوا ہو۔ ان کی گرفتاری کی افواہ صحیح ہونیکی صورت میں ہز میجسٹی سے توقع ہے۔ کہ وہ اس بارے میں کامل تحقیق فرمائینگے۔ کہ کہیں وہ ملاؤں کی دشمنی کا شکار تو نہیں بنائے گئے جو افغانستان میں مغربی علوم کی ترویج کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے دشمن بن رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کی گرفتاری کی افواہ غلط ہو۔

۲۶ - مارچ ۱۹۰۹ء

...... اس بڑی سازش میں بی بی حلیمہ کی شرکت قرین قیاس ہے جو اپنے لڑکے عمر جان کو تخت افغانستان پر بٹھانا چاہتی ہے۔ عمر جان اس

دفت ۲۰ سال کا نوجوان ہے۔

۲۹۔ مارچ ۱۹۰۹ء

کابل کی سازش

معلوم ہوا ہے کہ ہز میجسٹی امیرِ کابل کے خلاف سازش میں علاوہ ڈاکٹر عبدالغنی کے چند دوسرے سرکاری افسر شریک ہیں اور ہز میجسٹی کے چند ملازمانِ خاص بھی ملوث ہیں۔ سردار نصراللہ خان ہز میجسٹی کی ہدایت کے بموجب تحقیق کر رہے ہیں۔

۲۱۔ اپریل ۱۹۰۹ء

کابل کی جیل میں سازش کے ۳۰ ملزم ہیں۔ اور ۶۰ آدمیوں کی نگرانی ہو رہی ہے ڈاکٹر عبدالغنی، مولوی نجف علی اور دو اور پنجابی گرفتار ہیں ......

۲۳۔ اپریل ۱۹۰۹ء

ہز میجسٹی کے خلاف سازش

ماہِ حال کے پرچہ میں افغانستان کی سازش کے متعلق امیر صاحب کے ایک اردلی کا مضمون میری نظر سے گذرا جو غلط و افغات سے مملو تھا۔ معزز آدمی نے شروع میں فرمایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بالکل ایک معمولی رتبے کے آدمی ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ امیر صاحب نے ان کے حال پر بہت نوازش کی مگر یہ غلط ہے کہ وہ امیر صاحب کی ملازمت سے پہلے ایک معمولی آدمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی قابلیت اظہر من الشمس ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ گورنمنٹ سروس میں بھی کسی نہایت ہی معزز عہدے پر فائز ہو سکتے ہیں۔ اردلی صاحب کے مضمون کو پڑھ کر ہر صاحبِ نظر قیاس کر سکتا ہے کہ ان کی بات محض کسی ذاتی عداوت اور بغض پر مبنی ہے اور یہ بات قدرتی ہے کہ جب ایک آدمی بڑے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو بہت سے حاسد اسکی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور وہ اسکی ایذا رسانی کی کوشش

کرتے ہیں۔ اردلی صاحب کا یہ فرمانا کہ بی بی حلیمہ اور عمر جان کا اس سازش میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔ ایک ایسی بات ہے جسے ہر معمولی عقل کا آدمی جس نے پیسہ اخبار یا دوسرے اخباروں میں اس سازش کے متعلق مضمونوں کو وقتاً فوقتاً پڑھا غلط قرار دے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اردلی صاحب کو اصل حالات سے واقفیت نہیں کیونکہ امیر صاحب کا اردلی ہونا اس بات کی سند نہیں کہ وہ تمام حالات سے واقفیت رکھتا ہے۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ بی بی حلیمہ نے عمر جان کو بیماری کے بہانے سے کابل سے جانے سے کیوں روک دیا ہے ؟

اردلی صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ۔۔۔۔۔۔
سازش حبیبیہ سکول میں کیا کرتے تھے اور وہ افغانستان میں پارلیمنٹ رائج کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ناظرین کو یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی ایسا کوئی خیال افغانستان میں ظاہر نہیں کیا۔ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ابھی افغانستان کی ایسی حالت نہیں ہے کہ اسے پارلیمنٹ دی جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ بلحاظ تعلیم افغانستان بہت پیچھے ہے۔ آخر میں معزز اردلی لکھتا ہے کہ وہ (ڈاکٹر صاحب) اپنے آپکو بادشاہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ اردلی کا یہ قول مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ۔۔۔۔
ہر شخص جانتا ہے کہ ایک ہندوستانی جب تک کہ اس کے دماغ میں خلل نہ ہو یہ کبھی خیال نہیں کر سکتا کہ وہ افغانستان کا بادشاہ ہو اور میں یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کا دماغ بالکل اچھی حالت میں ہے اور میں اردلی کے اس بیہودہ خیال کو معزز ناظرین کے انصاف پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کہاں تک ہمارے ڈاکٹر صاحب کو اس الزام میں ملزم خیال کرتے ہیں اور ساتھ ہی اردلی صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اگر اس بات کو درست ثابت کر دیں تو میں مبلغ سو روپے جس اسلامی مدرسہ کو وہ لکھیں بطور تاوان بھیج دوں گا۔

آخر میں میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جناب ڈاکٹر صاحب کا حصہ اس سازش میں بالکل نہیں ہے۔ ان کی گذشتہ سات سال کی وفاداری اور ان تین سالوں کی خدمت کے بعد کیا یہ ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایسے جرم کے مرتکب ہوں۔ پہلے جب وہ واپس آئے تھے۔ اس وقت بھی بدخواہوں کی عنایت سے ان پر ایسا الزام لگایا گیا تھا۔ مگر بے قصور ثابت ہونے پر بری کر دیئے گئے تھے۔

جن دنوں وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کو عذر خواہانہ الفاظ سے امیر صاحب نے پھر بلا لیا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی کہ تم کو پہلے تکلیف پہنچائی۔ اب اپنے دل کو میری طرف سے صاف کر لو اور پھر افغانستان میں آ کر سررشتۂ تعلیم کے کام کو سنبھالو۔ اگر نہیں آؤ گے۔ تو قیامت کے روز تمہارا دامن گیر ہوں گا۔ تنخواہ ۶۰۰ روپے دی جائیگی۔ ان کا واپس جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے امیر افغانستان سے اپنا دل صاف کر لیا اور خدمت پر جانے کے واسطے راضی ہو گئے۔ وہاں امیر صاحب نے ان کی عزت کی اور اچھا کام کرنیکی وجہ سے ان کی تنخواہ ۹۰۰ روپے کر دی وہ جانتے تھے کہ یہاں تب تک رہ سکتا ہوں۔ جب تک امیر صاحب خوش ہیں اور جو خدمت افغانستان کی انہوں نے کی وہ شاید ہی کوئی کر سکتا ہو۔ ان کی موجودہ تکلیف صرف اس حسد و بغض کا نتیجہ ہے۔ جو بعض افراد کو ان سے بوجہ ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ہو گئی تھی اور امید ہے کہ ہز میجسٹی امیر حبیب اللہ خان سراج الملت والدین فرمانروائے افغانستان اس معاملے میں نہایت غور سے تحقیق فرما کر انکا قصور ثابت نہ ہونے پر ان کو اپنے عہدے پر بحال کر دیں گے۔

۲۶ ر اپریل ۱۹۰۹ء

آج کل اخبارات میں جو خبریں سازشِ کابل کے متعلق گشت کر رہی ہیں ان میں زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی اور ان کے بھائیوں کو بھی شریک سازش سمجھا جاتا ہے۔ تو اس وقت میرے پاس ایسے صحیح واقعات کابل سے نہیں پہنچے کہ جن کی بنا پر کسی وثوق کے ساتھ کچھ رائے قائم کی جائے مگر یا ایں ہمہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کی ذاتی خصوصیات کی بنا پر جو جو واقعات ڈاکٹر صاحب کے دورانِ قیام پنجاب میں دیکھے گئے اس قدر کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا ایسی سازش میں ملوث سمجھا جانا ضرور کسی غلط فہمی پر مبنی ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ تعلیمی معاملات میں دل چسپی لیتے رہے ہیں اور پولیٹیکل معاملات سے برابر محترز و مجتنب رہے۔ ظاہراً ان کا تعلیمی میلان انہیں کسی معاملہ میں شامل ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ انہوں نے اپنے قیام کابل میں اس امر کا صاف ثبوت دیا ہے کہ باوجود ملازمت و مرتبہ کے پنجاب میں کسی وسیع جائیداد کا پیدا نہ کرنا ان کے طامع نہ ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی اور علمائے کابل سے عداوت

ڈاکٹر صاحب نے سال گذشتہ میں ایک قرآن مجید لاہور کے ایک مطبع سے چھپوایا تھا لیکن چونکہ اسکی قرأت سے علمائے کابل کو اتفاق نہ تھا۔ اس لئے وہ سخت برافروختہ ہوئے اور امیر صاحب کو اطلاع دی گئی کہ ڈاکٹر نے مسلمانوں کے مذہب میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس پر امیر صاحب نے وہ قرآن مجید ایک مکان میں مقفّل کر دیا اور اسکی لاگت ڈاکٹر صاحب کی تنخواہ سے وضع کر لی ۔۔۔۔۔۔

اسکی تردید

ایک صاحب نے لاہور سے ۳ مئی ۱۹۰۹ء کو اسکی تردید اس عنوان سے کی:۔

علمائے کابل اور واقعہ قرآن مجید

اصل واقعہ یہ ہے کہ قرآن شریف ڈاکٹر صاحب موصوف نے لاہور سے سررشتہ تعلیم کابل کے لئے چھپوا دیا تھا۔ اسکی علامات وقف کی نسبت چند علمائے کابل نے سختی سے اختلاف کیا حتیٰ کہ اس کے خلاف انہوں نے فتوٰی بھی جاری کیا۔ اس پر سراج الملت والدین فرمانروائے افغانستان نے مستند علمائے کابل کو طلب کر کے امر بالا کے متعلق دریافت کیا۔ ان علماء نے اتفاق رائے سے قرآن شریف کی متنازع فیہ علامات وقف کو صحیح قرار دیا جس پر امیر صاحب نے ان علماء کو جنہوں نے اس سے مخالفت کر کے فتوٰی دیا تھا مورد عتاب کیا اور سزائے جرمانہ دی۔ یہ واقعات ایام گذشتہ میں اخبارات (ابزرور اور سول ملٹری گزٹ لاہور) میں بھی شائع ہوتے ہیں

۱۹۔ مئی ۱۹۰۹ء

کابل کی سازش

ملزمان سازش کی تحقیقات کے لئے ایک خاص عدالت قائم ہوئی ہے۔ جسمیں سنّی، شیعہ اور ہندوؤں کے قائم مقام ہیں۔۔ چنانچہ اس عدالت نے محمد حسین، محمد اعظم خان اور سردار عبد الغیاث خان کو مجرم قرار دیا۔ اور وہ توپ سے اڑا دیئے گئے۔ ڈاکٹر عبد الغنی اور ان کے دونوں ساتھیوں کا کچھ ذکر نہیں۔

۲۴۔ مئی ۱۹۰۹ء

ایک نامہ نگار شملہ مطلع کرتا ہے۔ کہ اس امر میں بہت کم شبہ ہے۔ کہ ہز میجسٹی امیر صاحب نے کابل پہنچکر دربار کیا جس میں متعدد مشتبہ سازشیوں کو توپ سے اڑا دیا گیا ہے ...... ہز میجسٹی نے نیم مذہبی تقریر کرتے

کے بعد مُلّاؤں اور درباریوں کو خلعت عطا کی راس اندیشے سے کہ پرانے خیال کے لوگ اور نہ بھڑک جائیں ۔ انگریزی کالج و مدارس کے قائم کرنیکی تجویز غیر معین وقت پر ملتوی کر دی گئی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ افغانستان کے قدیم عقیدے کے لوگ جنکی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انگریزی تعلیم کو کسی صورت دیکھنا نہیں چاہتے، بس اس کے ڈاکٹر بکیر عبدالغنی کو بھی ہرگز پسند نہیں کرتے لوکل اینگلو انڈین روزنامہ ہمعصر رقم طراز ہے کہ ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہوئی ہے، کہ ہز میجسٹی نے کابل میں دربار کے بعد سازشیوں کو پھانسی کا حکم صادر کیا ر صرف اس سازش کے منکشف ہونے ہی ہز میجسٹی نے جلال آباد میں چند آدمیوں کو توپ سے اڑا دیا ر

۲۸ ر مئی ۱۹۰۹ء

افغانستان میں سازش

امیر نے سرحد کے نامور مُلّاؤں کو بھی طلب کیا ہے جس میں نیرا کا مُلّا اکبر دیگر بہت سے ماتحت ملاؤں کے ساتھ کابل گیا ہے ر

. . . . حاضرین نے ہز میجسٹی کو اپنی وفاداری اور نمک حلالی کا یقین دلایا . . . . مزید برکہ رپورٹ کی گئی ہے پنجابی قیدی جن میں ڈاکٹر عبدالغنی بھی شامل ہیں چند روز ہوئے پا بہ زنجیر ہز میجسٹی کے سامنے لائے گئے. ہز میجسٹی نے کہا کہ ان کی رہائی کے متعلق پنجاب سے ان کے اعزہ کی طرف سے عرضی موصول ہوئی ہے، وہ ان کو معاف کر دینے پر تیار ہیں' بشرطیکہ وہ سازش کے پوست کنندہ حالات بیان کر دیں ر چونکہ قیدیوں نے کچھ بیان نہیں کیا لہٰذا وہ پھر جیل میں بھیج دیئے گئے اور ان کے ضبطیٔ جائیداد کا حکم صادر ہوا، لیکن اگر اصل سازش سے ان کا کچھ تعلق ہی نہ ہو تو وہ اس کی کیا کیفیت بیان کر سکتے ہیں ر

۲ر جولائی ۱۹۰۹ء

ڈاکٹر صاحب کی رہائی کی خبر

مگر ۱۲ر جولائی کو تردید .... لیکن اگر وہ پانچ ماخوذ شدہ بھی رہا کر دیئے جائیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آئندہ کوئی ہندوستانی مغربی تعلیم کے خلاف افغانوں کے تعصبات و توہمات کی موجودگی میں سررشتۂ تعلیم افغانستان میں ملازمت پسند کرے گا۔

۱۳۔ اگست ۱۹۰۹ء

انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کو لاہور کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے کہ حافظ جناب احمد دین صاحب بی، اے کو ڈاکٹر صاحب کی بجائے ڈائریکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ اور حبیبیہ یونیورسٹی کو ان کے انتظام میں دیا گیا ہے۔ کابل میں صرف یہی ایک ہندوستانی ہیں۔ جو ٹریننگ کالج لاہور کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ ...... ڈاکٹر عبدالغنی کے رخصت پر ہندوستان آنے کے زمانے میں بطور قائم مقام ڈائرکٹر کام کرتے رہے ہیں۔

۳۰۔ اگست ۱۹۰۹ء

ڈاکٹر عبدالغنی کی بریت

خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب ۷ر اگست کو رہا کر دیئے گئے ہیں۔ مگر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ با ایں ہمہ مدیر پیسہ اخبار نے اس خیال کا پھر اعادہ کیا ہے کہ پیسہ اخبار کا ابتدا ہی سے یہ خیال رہا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف محض شبہات ... اور مغربی تعلیم کے مخالف ملّاؤں کے کینہ و عناد کا شکار ہوئے ہیں۔ .....

نوٹ

احوال و آثارِ مولانا نجف علی خاںؒ کے مصنّف عبدالجلیل نجفی نے بڑی ہمت و محنت سے کام لیتے ہوئے قدیمی متعلقہ اخبارات ڈھونڈ نکالے اور ان میں سے یہ مذکورہ بالا مواد اخذ کیا۔

باب ہفتم

آزادیٔ فکر کے لئے سردار محمود طرزی اور ڈاکٹر عبدالغنی کا کردار :۔

ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں: سیاسی خیالات کی آزادی امیر حبیب اللہ خان کے عہد کی ایک نہایت اہم پیش رفت ہے، ایک ایسے ملک میں جہاں صدیوں سے آراء کی آزادی پر قدغن رہا ہو ایسی پیش رفت کا محرک اظہر من الشمس ہے۔ سراج الاخبار کے مدیر نوجوان افغان سردار محمود طرزی نے اپنے قیام ترکی میں دیکھا ہوا تھا کہ سلطان عبدالحمید کی جابرانہ حکومت تعلیم یافتہ طبقے کی آزادیٔ خیال کو بُری طرح کچل رہی تھی، اسی لئے اس نے وہاں نوجوان ترکوں کی پر زور حمایت کی تھی۔
افغانستان میں بھی آکر اس نے اپنے ساحرانہ قلم کے ذریعے آزادیٔ رائے کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور وہ زبان کی جادوگری کے ذریعے شیرینی سے ڈھپی ہوئی کونین امیر افغانستان کو پیش کرتا رہا جسے امیر خوشی اور شکریے کے اظہار کے ساتھ نگلتا رہا۔ اس نے محمود کو انعام واکرام سے نوازنے کے علاوہ محسن افغانستان کا خطاب دیا۔ محمود کے نظریات ہمیشہ حکومت برطانیہ کے خلاف ہوتے تھے۔ اسی لئے امیر نے محمود کے اخبار کے بعض شمارے جن میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی تھی دبا چھوڑے مگر اس کے باوجود برطانوی حکومت کیخلاف محمود طرزی کے حملے بڑے دلیرانہ اور شدید ہوتے تھے۔
سراج الاخبار کے اجراء سے پیشتر ہی امیر حبیب اللہ خان کے آمرانہ اقدامات کیخلاف رائے عامہ کا بیج بویا جا چکا تھا۔ مثلاً میں د عبدالغنی نے پُرامن طریق پر لوگوں کی فکری نشوونما کے سلسلے میں جو سکیم

شروع کی تھی۔ اسے امیر کے سامنے غلط انداز میں پیش کیا گیا، اور اس کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ یہ سکیم دوسرے لفظوں میں اس کے اختیارات پر ایک ضرب کاری تھی۔ میری گرفتاری سے لوگوں کو بہت تحیّر ہوا، بالخصوص وہ لوگ جو مجھے اچھی طرح جانتے تھے بہت حیران تھے کہ میری گرفتاری کا آخر سبب کیا ہے؟ یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ میں ایک آئینی حکومت کی تشکیل کرنا چاہتا تھا، جس کا صدر میں خود بننا چاہتا تھا۔ قارئین آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ میرے جیسا ایک شخص جو افغانستان میں محض ایک مسافر ہو، اس کے دماغ میں ایسا تصوّر بھی نہیں آسکتا۔ جگہ جگہ لوگ ایک دوسرے سے یہ سوال پوچھتے تھے کہ مشروطہ یا آئین کیا شے ہے، کیونکہ یہ ان کے لئے ایک نئی اصطلاح تھی۔ وہ یہ سوال کرتے تھے کہ ڈاکٹر آخر چاہتا کیا تھا اور جب ان کو پتہ چل جاتا تھا کہ مشروطہ سے مراد اسی طرح کا انتظام و انصرام ہے جو خلفائے راشدین کے عہد زرّین میں تھا، تو وہ خاموش ہو جاتے اور وہ میرے مدعا کو سراہنے لگتے۔

یہ تھی وہ منزل اور یہ تھی وہ صورت حال جب کابل کی اداس فضا پر سراج الاخبار نمودار ہوا اور اس اخبار نے اس چھائے ہوئے اندھیرے کے غلاف کو ہٹانا شروع کیا جس کے نیچے عوام ٹامک ٹوئیے مارتے رہے تھے۔ اس اخبار سے لوگوں میں اتنی بیداری آگئی کہ سکول کی ثانوی جماعتوں کے طلبہ بھی امیر افغانستان کی کونسل کے اراکین کو بے بصیرت سمجھتے تھے، اور طنزاً کہتے تھے کہ ان بے وقوفوں سے بہتر تو ہم انتظام چلا سکتے ہیں۔[1]

یہاں پر Leon B. Pollada کی کتاب کے اقتباس کو رقم کرنا مناسب ہوگا۔ کہ اسلام' جدیدیت اور حُبّ ملت کا آپس میں ملاپ بالآخر پان اسلامک اور پان ایشین اتحاد کے احیائے نو

---

[1] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان، صفحہ ۲۲۷

پر منتج ہوا۔ ڈاکٹر عبدالغنی اور سردار محمود طرزی دونوں اس مقصد کے لئے کوشاں تھے۔[1] سید رسول اور عبدالجلیل نجفی نے بھی علی الترتیب 'نگاہے بہ عہد امانی' اور 'احوال و آثارِ مولانا نجف علی خان' میں اس امر کا ذکر کیا ہے[2] کہ سید جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خان کی تحریکوں سے اثر پذیر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے ترکی، افغانستان اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اور اشاعتِ تعلیم کے لئے جدوجہد کی۔[2]

ینگ افغان پارٹی:۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا 'سراج الاخبار نے ہماری رہائی کے لئے بھی کئی بار بڑی جرأت سے درپردہ اشارے کئے۔ ایک خفیہ تنظیم وجود میں آگئی۔ یہ ایک منطقی حقیقت ہے کہ جب حکمران ظالم اور جابر ہو جائے۔ تو خفیہ تنظیمیں جنم پاتی ہیں۔ چونکہ نوجوان افغانوں کی یہ خفیہ تنظیم الاعلانیہ کچھ حاصل نہ کر سکی۔ لہٰذا انہوں نے امیر کو ایک گمنام خط لکھا جس میں اُسے نرمی سے سمجھایا گیا تھا کہ وقت اور توانیاں ضائع مت کرو اور عوام کے خزانے کو برباد مت کرو۔ اور یہ کہ امور سلطنت باقاعدگی سے سرانجام دیا کرو۔ کیونکہ تمہارے اعلےٰ منصب کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہی ہے۔ لیکن اگر تم باز نہیں آؤ گے اور ہماری درخواست کے مطابق اقدامات نہیں کرو گے تو پھر اس کے بدنتائج خود بھگتو گے'۔[3]

ترک جرمن مشن:۔

لیٹن بی پولاڈا کا کہنا ہے کہ 'ینگ افغان پارٹی جدید مفہوم کے اعتبار سے کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی

---

[1] 'ریفارم اینڈ ری بیلیئن ان افغانستان' صفحہ ۴۳۔

[2] 'نگاہے بہ عہد امانی' صفحہ ۴ و 'احوال و آثارِ مولانا نجف علی خان' صفحہ ۱۵

[3] A Brief Political History of Afghanistan' P 228-229

بلکہ یہ ان پڑھے لکھے نوجوانوں کا ایک گروہ تھا جو محمود طرزی کے سراج الاخبار اور ڈاکٹر عبدالغنی کے افکار سے بہت متاثر تھا۔ شہزادہ امان اللہ خان ڈاکٹر عبدالغنی، سردار محمود طرزی اور عبدالہادی داوی جیسے جدید فکر رکھنے والے حضرات اور قدامت پسند خلاف برطانیہ یا ترک نواز افراد مثلاً سردار نصر اللہ خان، سردار نادر خان اور کچھ علماء اس گروہ میں شامل تھے۔ ابتداء میں تو اس پارٹی کے افراد کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ اور اس کے نمائندے اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کے لئے کھلے بندوں اجتماعات منعقد کرتے تھے مگر جنگِ عظیم اول نے صورتحال بدل کر رکھ دی۔ امیر حبیب اللہ خان کے غیر جانبدار رہنے کی پالیسی سے (یا جس طرح بہتوں کا خیال ہے کہ امیر حبیب اللہ خان برطانیہ نواز تھے تو اس کے برطانیہ نواز فیصلے سے ینگ افغان پارٹی کی سرگرمیاں زیر زمین چلی گئیں۔ اور ان کے مخالف قدامت پسند لوگوں اور کچھ علماء نے اس پارٹی کے اراکین سے اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد کا سبب یہ بنا کہ اتنے میں ترکی جنگ میں کود گیا اور جرمنی کا ساتھ دینے لگا۔ چونکہ تحریک خلافت کی بناء پر اکثر علمائے دین کی وفاداریاں ترکی کے ساتھ تھیں لہذا وہ اپنی مذہبی وجوہ کی بناء پر برطانیہ کے مخالف ہو گئے۔ جبکہ ینگ افغان پارٹی کے افراد ملی وجوہ کی بناء پر برطانیہ کے مخالف تھے۔

صورتحال اس وقت اور زیادہ ابتر ہو گئی۔ جب ۲۶ ستمبر ۱۹۱۶ء کو ایک ترک جرمن مشن کابل میں پہنچا۔ اس مشن کا مدعا یہ تھا کہ کسی طرح افغان حکومت کو اس امر پر قائل مائل کیا جائے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر دے۔ اور یوں برطانیہ کی طاقت کو ضعف پہنچایا جائے۔[1]

سید رسول نے بھی ذکر کیا ہے۔ کہ اگر اس موقع پر حبیب اللہ خان ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو انگریز خطرے میں پڑ سکتے تھے[2] مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں۔ میں ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچا۔ جبکہ یہ ترک جرمن

---

[1] ریفارم اینڈ ری بیلین ان افغانستان، صفحہ ۴۴

[2] نگاہے بہ عہد امانی، صفحہ ۱۷

مشن ایک مہینہ پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ لیین بی پولاڈا نے لکھا۔ جوں جوں جنگ آگے بڑھتی رہی ان دونوں گروپوں میں اختلافات بڑھتے رہے پھر ایک وہ وقت آیا۔ جب ینگ افغان پارٹی نے امیر حبیب اللہ خان کو بغیر دستخطوں کے ایک خط بھیجا جس میں اصرار تھا کہ برطانیہ سے تعلقات توڑے جائیں اور اصلاحات کی جائیں۔ امیر اس خط کو پڑھ کر بڑا خشمناک ہوا اور اس نے اس کارروائی کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالغنی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔[1]

امیر حبیب اللہ خان پر قاتلانہ حملہ

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ۱۹۱۸ء کے آخر میں امیر حبیب اللہ خان کی سالگرہ کے موقع پر کابل کو چراغاں کیا گیا۔ امیر موصوف اپنی کار میں شور بازار میں سے گذر رہا تھا۔ کہ اتفاق سے کسی کے ہاتھوں ریوالور سے چلائی گئی ایک گولی اسکی کار میں آکر گری۔ موجود انتظامی عملہ سرعت سے اس مقام پر پہنچا جہاں سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی مگر وہاں سے باوجود تلاش بسیار کسی ملزم شخص کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر مستوفی الممالک مرزا محمد حسین کو تفتیش کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جس نے میرے خلاف ایک بہت بڑی سازش کا الزام گھڑا تھا۔ تاکہ ملک میں جدید تعلیم کے نفوذ کو روکا جا سکے۔ اس معاملے میں اس نے صحیح یا غلط ایک نوجوان شخص عبدالرحمٰن پر الزام عائد کیا۔ یہ عبدالرحمٰن پہلے حبیبیہ سکول کا طالب علم تھا۔ اور پھر سراج الاخبار کے سٹاف کا ایک ممبر رہا۔ اس کا باپ مجلسِ جان نثاراں کے کیس میں ماخوذ میرے ساتھ قید تھا۔ عبدالرحمٰن کے ساتھ ینگ پارٹی کے کئی اور افراد بھی گرفتار کئے گئے۔ ایک شخص عبدالہادی جو میرے ساتھ جیل میں دس برس قید رہا تھا۔ اور پھر اُسے رہا کر کے اُسے ایک اچھے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ اب ریوالور کے کیس میں دوبارہ دھر لیا گیا۔

---

[1] ریفارم اینڈ ری بیلیئن اِن افغانستان، صفحہ ۴۵

اس گرفتاری کو چھ ماہ گذر گئے مگر اس دوران ان گرفتار شدگان پر کوئی جرم عائد نہ کیا گیا امیر حبیب اللہ خان اپنے سرمائی دارالخلافہ جلال آباد کو جاتے والا تھا کہ اتنے میں ہندوستان کے ایک تارکِ وطن نے جس کا نام میں (عبدالغنی) نہیں لینا چاہتا اور جس نے تحریک خلافت کو خیر باد کہہ کر امیر حبیب اللہ خان کی ہم نوائی شروع کر دی مستوفی الممالک کو بتایا کہ حبیب اللہ خان کے خلاف افغانستان میں اور افغانستان سے باہر لوگوں کے احساسات تیز تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مستوفی الممالک نے اس ہندوستانی کے سامنے مکارانہ انداز میں میرا نام لیا۔ جس نے جواب میں کہا اس تمام سازش کا اصل محرک غالباً ڈاکٹر عبدالغنی ہی ہے۔ اس پر مستوفی الممالک نے امیر کو یہ تاثر دیا کہ ڈاکٹر عبدالغنی کی جماعت ایشیا بھر میں پھیل چکی ہے۔ اور ڈاکٹر کے متوالے افغانستان، ترکستان، ہندوستان اور ایران میں بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ جنہوں نے قسم کھا رکھی ہے۔ کہ وہ امیر حبیب اللہ خان کی حکومت کو بدل کر دم لیں گے۔ لہٰذا بہتری اس میں ہے کہ ڈاکٹر اور اس کے تمام قیدی ساتھیوں کو سزائے موت دیدی جائے۔

یہ رپورٹ امیر کو اُس دن پہنچی جب وہ جلال آباد کو روانہ ہو رہا تھا۔ امیر نے حکم دیا کہ میرے کیس والے تمام قیدی مختلف جیلوں سے ارگ شاہی میں منتقل کئے جائیں۔ چنانچہ دیگر قیدخانوں سے قیدیوں کو پابہ زنجیر ارگِ شاہی میں جمع کیا گیا اور سب پر کڑی نظر رکھی گئی۔

ڈاکٹر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی سزائے موت :-

امیر نے کہا کہ میں جلال آباد پہنچ کر ان تمام افراد کی پھانسی کی سزا کا اعلان کروں گا۔ اتنے میں ینگ افغان پارٹی کی خفیہ تنظیم نے اس بات پر

کہ امیر نے ان کی ہدایت اور تنبیہہ کو بالکل درخورِ اعتناء نہیں سمجھا امیر کو ایک اور گمنام چٹھی لکھ بھیجی اور اس میں اپنی گذشتہ دھمکیوں اور تنبیہوں کو دہرایا اور امیر کو صاف صاف سمجھا دیا کہ وہ اُن کی تنظیم کو ڈاکٹر عبدالغنی کی پارٹی کی طرح خیال نہ کرے جسے آسانی سے دبا دیا گیا تھا بلکہ امیر کو پتہ ہونا چاہیئے کہ دربار شاہی میں حتّٰی کہ حرم میں بھی ہمارے کچھ ساتھی ہیں اور اگر امیر نے اپنی اصلاح نہ کی تو وہ ہم سے بچ نہیں سکے گا۔

امیر نے یہ دوسرا خط پڑھکر کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ ہی اس نے ہمیں پھانسی دینے کے اپنے پروگرام کو منسوخ کیا اور حسبِ سابق کھانے پینے شکار کھیلنے، لہو ولعب کرنے جلسوں میں تقریریں کرنے اور زنان حرم کی محفل میں لطف اندوز ہونے میں محو رہا اور اس نے مملکت کے معاملات کی بہتری کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔[۱]

امیر حبیب اللہ خان کیخلاف رائے عامہ:

لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی بالآخر امیر کے المناک انجام پر منتج ہوئی۔ باہر کی دنیا کو امیر کا قتل بالکل غیر متوقع محسوس ہوا۔ جبکہ کابل میں لوگ حیران تھے کہ امیر کی آمرانہ وعیاشانہ روش کے ہوتے ہوئے اس کا دورِ اقتدار اتنا طویل کیسے ہو گیا۔ جب یہ دور طوالت پکڑ رہا تھا تو لوگ امیر کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ اس نے تو سلطنت کو چھوڑ دیا ہوا ہے مگر سلطنت اسے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ لوگوں کو امیر سے جو نفرت پیدا ہوگئی تو اس کے کئی اسباب تھے۔

(۱) وہ اپنے ذوق، لباس اور بود و باش میں بہت زیادہ مغرب زدہ تھا اور اس لئے لوگ اسے کافروں کے دوست سے بھی بدتر نام دیتے تھے۔ وہ ایسے

---

[۱] ڈ لے برلیفہ پولیٹکل ہسٹری آف افغانستان، صفحہ ۲۳۰ و ۲۳۱

پرندوں کا بھنا ہوا گوشت کھاتا تھا جس کا شکار اس کے یورپین باورچی نے کیا ہو۔ یہ وہ باورچی تھا جو پرندے کو ذبح کرنیکی بجائے اس کا سرکاٹ دیتا تھا۔ اس طرح کا مارا ہوا پرندہ جب وہ ہو بھی ایک غیر مسلم کے ہاتھوں سے مارا ہوا مسلمانوں کے عقیدے کی رو سے قطعاً حرام ہے۔

(۲) اس نے تمام درباریوں کو سوائے چند کے منع کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ ایک میز پر کھانا نہ کھائیں۔ لوگ اس کی اس حرکت کو ایک ادنیٰ حرکت سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پرانے مسلمان شہنشاہ اور سلاطین ایک ہی میز پر اپنے تمام درباریوں کے ہمراہ کھانا کھایا کرتے تھے۔

(۳) امیر بہت جلدی غصے سے بھر جاتا تھا۔ اور کسی کی معمولی سی لغزش پر بھی اسے گالیاں دینے لگتا تھا۔

(۴) وہ لوگوں کی شکایات کو ذاتی طور پر نہیں سنتا تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ وہ بڑا مغرور ہے اور اپنے آپکو بڑا اونچا سمجھتا ہے اور عوام سے بات کرنے کو وہ اپنی کسرِ شان سمجھتا ہے۔ حالانکہ امیر بزعم خویش یہ سب کچھ نظم ونسق کو بخیر وخوبی چلانے کے لئے کرتا تھا کیونکہ اس نے جگہ جگہ افسر مقرر کر رکھے تھے جو لوگوں کی مختلف شکایات کو سنتے تھے۔ اور فیصلے دیتے تھے۔

(۵) امور ریاست کی طرف اسکی بے توجہی آخر عمر تک جاری رہی، وہ زیادہ وقت فوٹوگرافی، طعام سازی (COOKING) حرم آرائی، شکار کنی (HUNTING) اور دل بہلاوے کے دیگر مشاغل میں صرف کرتا۔

(۶) امیر نے ترک جرمن مشن کا مدعا پورا نہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے مسلمانوں کے خلیفے کی درخواست یا خواہش کو رد کر دیا۔ اگرچہ سیاسی طور پر وہ اپنے اس اقدام میں حق بجانب تھا کیونکہ افغانستان کے اسوقت جو حالات تھے، وہ ایسے اقدام کے ہی متقاضی تھے۔ مگر لوگوں کو اس کی یہ روش ناگوار گذری۔

(۷) اس نے خزانۂ عامرہ کو ذاتی تعیشات پر پانی کی طرح بہا دیا جس کے لئے

اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ وہ خزانہ تھا جسے امیر عبدالرحمان نے بڑی محنت سے بنایا تھا مگر امیر حبیب اللہ خان نے اس خزانے کو اپنی بے شمار عورتوں کے ملبوسات اور محل کے فرنیچر اور تزئین وغیرہ پر لٹا دیا۔

امیر کا قتل امیر جلال آباد میں اپنے قیام کے دوران سیر و تفریح کے لئے درہ نور کی طرف نکل جاتا تھا۔ وہیں پر مستوفی الممالک مرزا محمد حسین نے اسے میرے کیس کی بابت یاد دھانی کرائی۔ امیر نے اسے کہا۔ اچھا تم سزائے موت لکھو۔ میں اس پر دستخط کر دوں گا۔

مستوفی نے تختۂ دار پر ہمارے لٹکائے جانے کا حکم نامہ لکھا اور امیر کے سامنے رکھ دیا تاکہ وہ اس پر دستخط کرے۔ امیر اس دوران کسی گفتگو میں مصروف تھا اور ہماری موت کا پروانہ اسکی میز پر پڑا تھا۔ باتوں میں کافی دیر ہو گئی اور اب امیر کے آرام کرنے اور سونے کا وقت ہو رہا تھا۔ مرزا مستوفی بے قرار ہو رہا تھا۔ اس نے امیر کی توجہ کو اپنی طرف کرنے کے لئے کاغذ کو اس طرح ہلایا۔ کہ اس میں سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو اور پھر اس کے سامنے رکھ دیا۔ امیر نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ عالی جناب! یہ ڈاکٹر اور اس کے ساتھیوں کی موت کا حکم نامہ ہے۔ امیر نے کاغذ کو پکڑ کر اسے پڑھا۔ ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر کہا، اچھا اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ اس وقت تو میں آرام کروں گا تم اس کاغذ کو سنبھالے رکھو۔ سیر سے لوٹونگا تو پھر اس پر دستخط کر دوں گا۔ قسمت نے مداخلت کی۔ تقدیر کے دفتر میں ابھی ہماری موت پر تصدیق کی مہر ثبت نہیں ہوئی تھی۔ صبح کو امیر درہ نور کو چلا گیا۔ واپسی پر جب وہ ایک مقام کلہ گوش سے گذر رہا تھا اور ایک گھوڑے پر سوار ایک خوبصورت ندّی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا تو وہ اس شفّاف پانی سے مسحور ہو گیا جو ایک پتھریلے فرش پر اٹکھیلیاں کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس میں چمکدار مچھلیاں اچھل اچھل کر کبھی باہر نمودار ہوتیں اور کبھی پھر کسی پتھریلے غار میں گھس جاتیں۔

دور دراز علاقوں میں جہاں انسانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ اور جہاں کا ماحول انسانی مداخلت سے مامون رہا تھا۔ فطرت کے اس سیدھے سادھے کھیل نے اسے اپنی طرف بہت جلب کیا۔ اور اس نے رات وہیں پر گذارنے کا فیصلہ کیا۔ چائے کی ایک پیالی پی کر اس نے اپنے آپ کو ایک گونہ تر و تازہ کیا اور پھر اس ندی کی طرف چل پڑا اور وہاں سے اس نے کچھ مچھلیاں پکڑیں۔ اس مقام کے شاعرانہ ماحول نے اُسے بہت متاثر کیا۔ جب پکڑی گئی مچھلیاں کچھ وقت کے لئے پانی سے باہر رہیں تو وہ مر گئیں اس پر امیر کو انسانی زندگی کی ناپائیداری پر سوچ پیدا ہوئی اور اس نے کہا اس طرح ایک انسان کا دم اسوقت قفسِ عنصری سے نکل جاتا ہے۔ جب موت کا ہاتھ اچانک اسے اچک لیتا ہے۔ شاید امیر کو اپنی نزدیک پہنچ رہی موت کا پہلے سے احساس ہو گیا تھا۔

اسی رات جب امیر سو گیا تو موت کا نظر نہ آنے والا ہاتھ اس کے خیمے میں گھس گیا اور اس ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اسکی بائیں کنپٹی کو گولی لگی۔ جس سے وہ ۲۰۔ فروری ۱۹۱۹ء کو راہی ملک عدم ہو گیا اور گولی مارنے والا ہاتھ نظر آنے بغیر کھسک گیا۔ اب شور و غل برپا ہوا۔ محافظ سپاہی آگے پیچھے دوڑے۔ افسران سرعت سے جائے واردات پر پہنچے۔ شہزادوں کو جگایا گیا۔ متوشانہ تحقیقات کرائی گئیں۔ مگر موت کا فرشتہ غائب ہو چکا تھا اور وہ اپنے پیچھے امیر حبیب اللہ خان کے جسد مردہ کے سوا کوئی نشان نہیں چھوڑ گیا تھا یوں امیر حبیب اللہ خان کا ۱۸ سالہ آمرانہ عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔[1] علاوہ کچھ مبصروں کا خیال ہے کہ امیر حبیب اللہ خان کے قتل کی سازش کے پیچھے شہزادہ امان اللہ خان کی والدہ علیاء حضرت کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے امان اللہ خان بعض وجوہ کی بناء پر اپنے باپ

---

[1] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان صفحہ ۲۳۱ تا ۲۳۳

امیر حبیب اللہ خان کی نظروں سے گر گیا تھا اور معتوب ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اب افغان لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے مہم چلائی۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ اہم شخصیتوں کی امداد کی جنہوں نے بھرپور اسکی امداد کی۔ بعض اور ذرائع کے مطابق بادشاہ حبیب اللہ خان کیخلاف اس سازش کی ابتداء وار پارٹی یا ینگ افغان پارٹی کے اراکین کی طرف سے ہوئی تھی جس کا ایک اہم رکن شہزادہ امان اللہ خان بھی تھا۔

باب ہشتم

ڈاکٹر صاحب بعہدِ امیر امان اللہ خان

شہزادہ امان اللہ خان کے ابتدائی حالات

بیئن بی پولاڈا اور سید رسول دونوں نے لکھا، امیر امان اللہ خان فرمان روائے افغانستان کی ولادت ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ اس نے ایسے زمانے میں پرورش پائی جب عالمِ اسلام پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور سر سید احمد خان جیسے مسلمان مصلحین نے شمالی افریقہ سے ہندوستان تک مسلمانوں کے احیائے نو کیلئے تبلیغی تحریکیں چلائیں .... امان اللہ خان کے بچپن کے متعلق یقین کے ساتھ زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بیرون خانہ کھیل خاص طور پر شکار اور ٹینس بڑے شوق سے کھیلتا تھا۔ اس نے رسمی تعلیم زیادہ تر اس فوجی سکول سے حاصل کی جو امیر حبیب اللہ خان نے بلند طبقے کے بچوں کے لئے قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالغنی کے بڑے بھائی مولانا نجف علی خان عاصی بھی کئی برسوں تک اس کے اتالیق رہے۔ تقریباً تمام خبر رساں حضرات نے جو امان اللہ خان کو جانتے تھے یہی اطلاع دی ہے کہ وہ تیز ذہانت اور متجسسانہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ ایک اچھا سامع تھا اور بہت سوچ سمجھ والے اور مؤثر سوالات کیا کرتا تھا۔ اس کے زیادہ سوالات افغانستان سے باہر کی دنیا کے متعلق ہوتے تھے۔ اُسے مذہبی سوالات جوابات سے بھی بہت دلچسپی تھی اور وہ اکثر ملاؤں کو طویل بحث ومباحثہ میں مصروف رکھتا تھا۔

امان اللہ خان کی پہلی شادی ۱۶ برس کی عمر میں ہوئی۔ یہ شادی صرف چند دن تک نبھی اور طلاق پر منتج ہوئی۔ ۱۸ برس کی عمر میں اسکی دوسری شادی ہوئی۔ یہ شادی ایک کبیر خاندان کی لڑکی شہزاد خانم سے ہوئی جس کے بطن سے شہزادہ ہدایت اللہ پیدا ہوا۔ شہزاد خانم بچے کی ولادت ہوتے ہی فوت ہوگئی۔ یہ دونوں شادیاں امان اللہ خان کی والدہ علیہ حضرت کے ذریعے ہوئیں۔ امان اللہ خان کی تیسری شادی اُسوقت ہوئی جب اسکی عمر ۲۱ سال تھی۔ اس بار اُسے جو دلہن ملی وہ اس کے اپنے انتخاب کی تھی۔ یہ سردار محمود طرزی کی بیٹی تھی۔

اگرچہ امیر حبیب اللہ خان کی بہت سی بیویاں اور بیٹے تھے لیکن علیا حضرت کو امان اللہ خان کے مستقبل کے بارے میں سردار نصر اللہ خان اور علیا جناب کے ماسوا کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ علیا جناب سردار نادر خان کی بہن تھی اور وہ اپنے بیٹے اسد اللہ خان کو آئندہ افغانستان کے تاج و تخت کا مالک دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس خطرے کے پیش نظر علیا حضرت نے امان اللہ خان کی اعلےٰ تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجّہ کی تاکہ دعوے داروں کے مقابلے میں اسے برتری اور تفوّق حاصل رہے۔ [1]

امان اللہ خان کی سیرت

لیئن بی پولاڈا نے ڈاکٹر عبد الغنی کے حوالے سے لکھا ہے "امان اللہ خان تیس برس کا ایک نوجوان ہے۔ وہ درمیانے قد کا ہے۔ وہ خوبصورت اور اچھی ساخت کے جسم کا مالک ہے۔ اس کے بال اور آنکھیں کالی ہیں۔ وہ ایک مضبوط اور صحت مند بدن رکھتا ہے۔ لیکن اسے زکام نزلے کی شکایت رہتی ہے اور جب وہ زیادہ کام کرے تو یہ تکلیف جلدی عود کر آتی ہے۔ اس میں دل آویزی اور نرم خوئی کی خوبی ہے۔ وہ مشکلات سے گھبراتا نہیں۔ اسکی تعلیم زیادہ نہیں مگر

---

[1] 'Reform and Rebellion in Afghanistan' P 37–40
'نگاہے بعہد امانی' صفحہ ۲

وہ چودہ سال کی عمر سے لیکر ابتک ملکی معاملات میں حصہ لیتا رہا ہے اور اس بنا پر اسے کام کا کافی زیادہ تجربہ حاصل ہو گیا ہے۔ میرے بھائی (مولانا نجف علی خان) نے مجھے بتایا کہ اسکے بچپن ہی میں جب اس کے سامنے کوئی معاملہ لایا جاتا تو سریع الذہانت ہونے کی وجہ سے وہ خود اُس معاملے کا لبِّ لباب اخذ کر لیتا اور اوائل عمر ہی میں وہ ایک مضبوط قوتِ فیصلہ کا مالک تھا وہ ایک محنتی طالب علم نہ تھا مگر وہ ہر اس بات میں دلچسپی لیتا تھا جو اسکی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ وہ اپنی والدہ سے بہت ڈرتا تھا اور اسکی بہت عزت کرتا تھا۔ اب بھی وہ اس کا بہت احترام کرتا ہے۔ بچپن ہی سے اسکی طبیعت مزاح کی طرف مائل تھی جیسا کہ اب بھی ہے۔ وہ اب بھی اکثر طعام و نوش کے بعد یا کھیل کے بعد احباب کی محفل میں خوش گپیوں اور مزاح سے خود بھی محظوظ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتا ہے وہ کپڑوں کا ایک سوٹ متواتر تین چار ماہ تک پہنتا رہتا ہے، وہ لیلن کپڑے کا وافر استعمال کرتا ہے، وہ خوراک اور لباس کے معاملے میں سادگی پسند ہے۔ وہ بہت محنت کرتا ہے اور صبح ۸ بجے سے لیکر آدھی رات تک کام کرتا رہتا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ تمام سرکاری ملازمین بھی اس کی طرح کام میں محنت کا مظاہرہ کریں۔ ارگ شاہی[1] کے صحن میں پانی کا ایک چھوٹا سا

---

[1] ارگِ شاہی کا اس سے پہلے بھی کئی بار ذکر آیا۔ ہو سکتا ہے کہ قارئین مغالطے میں رہیں کہ آیا یہ قید خانہ ہے یا کہ شاہی محل ہے لہٰذا یہاں پر اس کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہو رہا ہے۔

ارگ یا ارک کابل میں واقع ایک شاہی قلعہ ہے جس کے ملحق شاہی محل اور شاہی قید خانہ ہے۔ ارگِ شاہی سے عموماً کابل کا قید خانہ مراد لیا جاتا ہے مگر یہاں شاہی محل بھی واقع ہے اور شاہی قلعہ بھی، اور یہ تینوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں۔

(بحوالہ نالۂ درد صفحہ از مولانا نجف علی خان عاصی)

تحفۂ امانیہ کی ابتدائی نظم سے بھی جس میں مولانا نجف علی خان کی طرف سے اعلیحضرت

(باقی اگلے صفحے پر)

تالاب ہے۔ امیر موصوف وقتاً فوقتاً بعد دوپہر گھوڑ سواری یا موٹر سواری سے بیشتر یا پھر صبح کام شروع کرنے سے پہلے پہلے بندوق لیکر اس تالاب کے کنارے جاتا ہے اور چند منٹ تک راج ہنسوں کے شکاری شغل کرتا ہے۔

اُس نے اپنے دادا کی طرح خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم کر رکھا ہے جو کہ اُسے روزانہ کابل میں وقوع پانے والے خاص واقعات سے باخبر رکھتا ہے۔ ہر اہمیت والے شخص اور حیثیت والے فرد پر نظر رکھی جاتی ہے اور ان اشخاص کی حرکات و سکنات سے بھی مطلع رہا جاتا ہے جو آئے دن طرفداریاں اور پارٹیاں بدلتے رہتے ہیں۔

وہ وسیع سماجی و سیاسی نظریات کا حامل ہے اور ہمیشہ دربار میں یہی کہتا ہے کہ اسے عام لوگوں میں سمجھا جائے، اُسے اپنے افغان ہونے پر فخر ہے۔ وہ خارجی ممالک سے درآمد کئے گئے ملبوسات کے مقابلے میں ملکی صنعت کے بنے ہوئے کپڑوں کو ترجیح دیتا ہے اپنی کونسل میں وہ بہت زیادہ جمہوری رویّے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے اپنی کونسل تک کہا تھا فرض کیا کہ آپ اکثر لوگ بالشویک نظام حکومت چاہتے ہیں ایسی صورت میں میں پہلا شخص ہونگا جو ایک بالشویک ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کروں گا تاکہ اس نظام

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

غازی امان اللہ خان کو اس کی تخت نشینی کے موقع پر تہنیت پیش کی گئی ظاہر ہو رہا ہے کہ شاہی قیدخانہ شاہی محل سے زیادہ دور نہیں، اس نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ زندانم الٰے برجِ شمالی	بود دو صد قدم تا بابِ عالی
میان ما و تو بُعدے عجیب است	ز قصرت کلبۂ احزاں قریب است

ترجمہ:- اے غازی امان اللہ خان! میری قید کی کوٹھری سے برجِ شمالی جہاں تمہارا شاہی محل ہے دو سو قدم کا فاصلہ ہے۔

اے شاہ! تمہارے اور میرے درمیان کیا یہ عجیب قسم کی دوری نہیں کیونکہ میرے قید کے کمرے سے تمہارا قصرِ شاہی بالکل ہی قریب ہے۔

کی روشنی میں سوچے گئے ان اقدامات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے جو آپ لوگوں کے خیال میں افغانستان کے لئے نافع ثابت ہو سکے۔[1]

عہد شکنی

جب امیر حبیب اللہ خان ہندوستان آیا تھا تو انگریزوں کی حکومت نے اسکے سب سے بڑے بیٹے سردار عنایت اللہ خان کو ولی عہد تسلیم کیا تھا یہ تھی وہ بنیادی غلطی جو امیر حبیب اللہ خان سے ہوئی اور اسی سے آئندہ کی تخت نشینی کے معاملے میں شر پیدا ہوا۔ جب حبیب اللہ خان تخت نشین ہوا تھا تو اس نے حلفیہ طور پر لکھ دیا تھا کہ اسکے بعد سردار نصر اللہ خان تخت نشین ہوگا، مگر اس نے عہد شکنی کرتے ہوئے اپنے بیٹے سردار عنایت اللہ خان کو تخت کا وارث مقرر کر دیا۔ امیر حبیب اللہ خان جب ہندوستان سے پلٹا تو تو وہ عیش و عشرت میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ اسے سردار نصر اللہ خان اور سردار امان اللہ خان کی طرف سے تخت کے حصول کے سلسلے میں سازشوں کے خطرے پر نظر رکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

جب امیر موصوف نے عنایت اللہ خان کی ولیعہدی کا اعلان کیا تو زیرک و چالاک امان اللہ خان اپنے چچا سردار نصر اللہ خان کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ عنایت اللہ خان تخت کا وارث کیسے بن سکتا ہے جب آپ جیسے بزرگ خاندان میں موجود ہیں۔ میری والدہ علیا حضرت بھی تخت پر آپ کا حق تسلیم کرتی ہے۔ سردار نصر اللہ خان کو امان اللہ خان اور اسکی والدہ کی وفاداری پر اس قدر اعتبار ہو گیا کہ اُس نے کئی راز کی باتیں بھی امان اللہ خان کو بتا دیں۔[2]

باپ کے قتل کے بعد امان اللہ خان کو درپیش صورتحال

امان اللہ خان نے اپنے باپ امیر حبیب اللہ خان کو مروانے کی پہلی

---

[1] ' ریفارم اینڈ ری بیلیئن ' صفحہ ۵۰

[2] ' اے ریلو صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۵

کوشش ۱۹۱۸ء میں اُس وقت کی جب وہ اپنی سال گرہ کی تقریب کے سلسلے میں شور بازار کابل میں سے گذر رہا تھا۔ قتل کرنے کی دوسری کوشش اس نے ۱۹۱۹ء میں کی جب امیر کلہ گوش (جلال آباد) میں سیر و تفریح کے لئے گیا ہوا تھا۔[۱]

جب امیر درہ کلہ گوش میں قتل کیا گیا تو صبح سویرے اسکی نعش کو کوئی رسم منائے بغیر موٹر میں ڈال کر جلال آباد لایا گیا۔ اس اچانک واپسی سے جلال آباد میں موجود شاہی خاندان کے افراد ششدر رہ گئے۔ ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں اس کے جلد بعد حبیب امیر کی حزینہ موت کی خبر کانوں کان سب کو ہوگئی تو سناٹا سا چھا گیا اور کونسل کے درباریوں اور افسروں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں اور باتیں تو ہوئیں مگر کسی نے یہ سوال نہ اٹھایا کہ یہ قتل آخر کس نے کیا ہے۔ بہرحال چند منٹ کی بات چیت کے بعد کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ سب سے پہلے امیر مرحوم کے کفنانے دفنانے کا بندوبست کرنا چاہیئے اور باقی معاملات پھر بعد میں طے کئے جائیں گے۔ تجہیز و تکفین کا مرحلہ بڑی جلدی طے ہوا اور اس کے فوراً بعد تخت نشینی کا سوال اٹھایا گیا[۲]

ابر یا ہینڈ بک فار افغانستان کے مصنف کے تاثرات امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بارے میں یہ ہیں کہ امان اللہ خان نے اپنے باپ کے قتل کے سلسلے میں کچھ نہ کیا۔ جب امان اللہ خان نئی تقرریاں کرنے لگا اور اس نے سردار عبدالقدوس کو وزیر اعظم مقرر کرتے ہوئے اپنی ایک نئی کابینہ بنالی تو مصاحب برادران[۳] کو کوئی ذمہ داری سپرد نہ کی اور انہیں زیر حراست رکھا گیا ہرات کی طرف کچھ ہلچل پائی جاتی تھی جہاں مصاحبین کے خاندان کے دو افراد سردار سلیمان اور سردار ہاشم علی الترتیب گورنر اور کمانڈر انچیف تھے۔ جلال آباد کے فوجی دستے بھی نشاکی تھے کیونکہ انہیں

---

[۱] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان، حصہ چہارم صفحہ ۲ تا ۴

[۲] اے ریویو آف دی پولیٹیکل سیچوئیشن، صفحہ ۸۵

[۳] مصاحبین سے مراد سردار نادر خان اور اس کے بھائی شاہ ولی شاہ محمود اور ہاشم ہیں جو کہ امیر حبیب اللہ خان کے مقربین میں سے تھے اور اسی لئے مصاحبین کہلائے مصاحب فارسی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے۔ ترجمانی۔ ضی

جتنی تنخواہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اس سے کم کی انہیں پیش کش کی گئی تھی۔

۱۳۔ اپریل کے روز امان اللہ خان نے اس سارے جھنجٹ کو ایک دربار میں حل کرنے کی کوشش کی۔ اسی دربار میں مقدمات کی سماعت بھی مطلوب تھی۔ سردار نصر اللہ خان کو عمر بھر کے لئے قید کر دیا گیا جہاں وہ ایک سال بعد رحلت کر گیا سردار عنایت اللہ خان کو درون خانہ نظر بند کر دیا گیا۔ سردار نادر خان، سردار شاہ ولی اور خاندانِ مصاحبان کے دوسرے افراد کو بے جرم قرار دیتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔ چونکہ امیر مرحوم کے قتل کے سلسلے میں کسی نہ کسی پر ذمہ داری ٹھہرانا ضروری تھا اس لئے ایک نوجوان کرنیل کو جو امیر شہید کے خیمے پر متعین حفاظتی دستے کا انچارج افسر تھا تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ مگر لوگوں کو پتہ تھا کہ امیر شہید کے قتل کا اصل محرک کوئی بڑا ہاتھ ہے اور وہ ہاتھ امان اللہ خان کا ہو سکتا ہے۔

یہاں پر SORAB K.H. KATRAK کے تاثرات بھی جو امیر شہید کے معمۂ قتل کے بارے میں ہیں بیان کر دیئے جا ہیں

۲۰۔ فروری ۱۹۱۹ء کو امیر حبیب اللہ خان ایک دورے کے سلسلے میں جلال آباد کے مقام پر ٹھہرا۔ امیر کے خیمے کے گرد اس کے بیٹوں اور پوتوں کے خیمے تھے۔ آدھی رات کو ایک بندوق کی آواز سے رات کا سکوت ٹوٹ گیا یہ آواز امیر کے خیمے سے آئی تھی۔ سب اس خیمے کی طرف بھاگے اور انہوں نے دیکھا کہ امیر ہلاک کر دیا گیا ہے۔

اگر سوچا جائے تو یہ معلوم ہوگا۔ کہ امیر کی ہلاکت پر ایک پیچیدہ راز کا کفن پڑا ہوا ہے یہ واقعات اب تاریخی معاملات بن چکے ہیں کہ کس طرح سردار نصر اللہ خان نے اس وقت کے گورنر کابل امان اللہ خان کو لکھا کہ اسے یعنی نصر اللہ خان کو فرمانروائے افغانستان تسلیم کیا جائے۔ اور کس طرح امان اللہ خان نے یہ جواب دیا کہ وہ یعنی امان اللہ خان پہلے قوم سے تو مشورہ کر لے۔[1]

---

[1] 'Through Amanullah's Afghanistan' ص

ڈاکٹر عبدالغنی کی رہائی میں التوا: امیر حبیب اللہ خان کی وفات کے بعد جلال آباد کے تمام قیدی سوائے متوفی مرزا محمد حسین امیر امان اللہ خان کے حکم سے چھوڑ دیئے گئے۔ اسی شام یعنی امان اللہ خان کی تخت نشینی کے چھ ہفتے بعد ہم تینوں بھائی (یعنی میں عبدالغنی مولانا نجف علی اور مولوی محمد چراغ) رہا کر دیئے گئے۔ امیر امان اللہ خان کا اپنا ارادہ تو ہمیں اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد رہا کرنے کا تھا۔ مگر جب اس نے ہماری رہائی کا معاملہ اپنی کونسل کے سامنے رکھا تو چند وزراء نے اسے مشورہ دیا کہ "اے عالی جاہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر آپ کے باپ شہید حبیب اللہ خان کے خلاف سازش کرنے کا الزام تھا۔ اور اب جبکہ وہ سچ مچ قتل کر دیا گیا ہے تو انہیں چھوڑنا عقلمندی نہیں ہو گی۔ اس پر امیر امان اللہ خان مسکرایا اور اس نے ہماری رہائی کو اس وقت تک ملتوی رکھا جب تک اصل قاتل ڈھونڈ نہیں لیا گیا۔

مرزا محمد حسین متوفی الممالک کا حشر: مرزا محمد حسین اپنے آبائی ضلع کوہستان کو بھاگ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں وہ اپنے قبیلے کے آدمیوں میں محفوظ ہو گا۔ اور وہاں اس کے ماتحت سردار اسکی امداد کرینگے۔ مرحوم امیر نے اسے اس ضلع کے تمام خوانین کا سردار مقرر کیا ہوا تھا اور وہ امیر موصوف کے بعد سلطنت افغانستان کا سب سے طاقتور شخص تھا۔ اس لئے اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے بہت سے قبائل کے مابین اپنے قلعوں میں کابل کی حکومت کے گزند سے محفوظ رہے گا مگر فوراً کچھ سپاہی اس پر جھپٹے اور اُسے گرفتار کر کے گھسیٹتے ہوئے لے آئے۔ جب مرزا سمیت جلال آباد کے قیدی کابل میں لائے گئے تو انہیں ارکِ شاہی میں مقید رکھا گیا۔ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا کام امیر حبیب اللہ

خان مرحوم کے قتل کے بارے میں تحقیقات کرنا تھا بالآخر اس کمیٹی نے سوچ بچار کے بعد ایک رپورٹ تیار کی جس میں ایک کرنیل غلام رضا کو قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس کرنیل کو بہت جلد تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہماری رہائی ہو گئی۔

اس کے تین دن بعد ہمارے بدترین دشمن مرزا محمد حسین کوتوت کے ایک درخت پر لٹکا کر پھانسی دیدی گئی۔ کروڑوں روپے کی اسکی جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ جب اُسے موت کی سزا سنائی گئی تھی تو اس نے امیر امان اللہ خان کے سامنے تین گذارشات پیش کیں:۔

(۱) اس نے درخواست کی کہ اسے معاف کر دیا جائے اس پر امان اللہ خان نے جواب دیا تمہاری سیاہ کاریوں کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ غالباً اللہ تعالےٰ بھی تمہیں معاف کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔ تو پھر میں تمہیں کیسے معاف کر سکتا ہوں؛

(۲) اس نے خواہش ظاہر کی کہ 'میرے پیچھے میرے بچوں کی اچھی تعلیم کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں'۔ اس پر امیر نے کہا، بھیڑیے کے بچے بھی تو آخر بھیڑیے بنتے ہیں بھیڑیوں کے بچوں کو تعلیم دینا گویا بدتر بھیڑیے تیار کرنے کی ایک سعی ہوگی۔

(۳) اس نے اس آرزو کا اظہار کیا کہ میری نعش کو میری مری بیوی کے پہلو میں دفن کیا جائے، مگر امیر نے اسکی اس آرزو کو بھی پورا کرنے سے انکار کر دیا۔

آخر اسے ارگ شاہی کے صحن کے ایک کونے میں واقع ایک شہتوت پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی، [1]

ری ٹیلی سٹوارٹ نے لکھا 'امان اللہ خان نے تخت پر بیٹھتے ہی دو قرضے اتارے۔ ایک تو اسنے اپنے پرانے استاد ڈاکٹر عبدالغنی کو طویل قید سے رہا کیا۔ اور دویم اس نے متوفی الممالک محمد حسین کو پھانسی پر لٹکایا۔' [2]

---

[1] اے ریویو آف پولیٹیکل سیچویشن ان سینٹرل ایشیا۔ صفحہ ۸۷، ۸۸، ۹۰ و ۹۱

[2] FIRE IN AFGHANISTAN P 78-79

نئی حکومت: اب حکومت کی تنظیم نو کا کام شروع ہوا امان اللہ خان نے اپنے سسر سردار محمود طرزی سے حکومتِ ترکی کی بابت بہت کچھ جان رکھا تھا اور نیز بعد میں اس نے اخبارات سے ترکی کے انقلاب کے متعلق پڑھا تھا وہ اثرات دامار کو منتقل ہوا۔ مگر افغانستان کے حالات جمہوری اقدار کو عام کرنے کے لئے موافق نہ تھے۔ للہذا اس نے وزارتی نظام شروع کیا جو کہ ایک طویل آمرانہ نظام کے بعد جمہوریت کی طرف پہلا قدم تھا۔

نئی کونسل: نئے امیر نے ایک نئی کونسل بنائی جس میں مملکت کے وزراء اور کچھ دوسرے زعماء شامل تھے ان میں سے کچھ تو کونسل کے مستقل ممبران تھے۔ اور کچھ کو وقتاً فوقتاً اس وقت مدعو کیا جاتا تھا۔ جب وسیع تر مسائل پر طویل بحث مباحثہ کرنا مطلوب ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبد الغنی اور مولانا نجف علی خان اس کونسل کے بھی رکن تھے۔

عوام کی ناراضگی: جب ترکی کی پرخطر حالت نے یہ تقاضا کیا کہ دنیا کے تمام مسلمان دشمنوں کے خلاف ترکوں کی ٹھوس حمایت و امداد کیلئے متحد ہوجائیں تو امیر حبیب اللہ خان فرمانروائے افغانستان نے جو مسلمانِ ترکی کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا حکمران تھا اس معاملے پر سکوت برتا۔ اس کی اس روش سے مسلمانوں کو بہت ناراضگی اور مایوسی ہوئی۔

ہندوستان میں مارشل لاء: اس وقت جب ہندوستان خصوصاً پنجاب ہندوستانی حکومت کے عائد کردہ مارشل لاء کی سختیوں سے کراہ رہا تھا تو ان حالات میں افغانستان کے نئے امیر امان اللہ خان کی حکومت اور اینگلو انڈین حکومت کے مابین آئندہ کے تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اتنے میں اس نئے امیر نے موجودہ رجحانات کے زیر اثر افغانستان کی مکمل خودمختاری کا اعلان کر دیا۔

باوجود یہ کہ ہندوستانی عوام نے حکومت برطانیہ کو خوش کرنیکی خاطر ہندوستان سے باہر جاکر برطانیہ کے لئے فتوحات حاصل کی تھیں۔ اینگلو انڈین حکومت نے ان پر بمباری کی اس لئے یہ کرا ہتے عوام بھاگ کر شمال مغربی سرحد کو عبور کرکے افغانستان کی سرزمین میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ ادھر سے باغستانی لوگ گروپوں میں سرحد پار کرکے ہندوستانی حکومت پر حملے کرنے لگے۔ اس صورتحال نے امیر اور اسکی کونسل کو چونکا دیا۔ سرحدوں پر موجود افغان دستوں کو حکم دیا گیا کہ سرحدوں پر قبضہ کرکے انہیں آنے جانے والوں کے لئے بند کردیا جائے ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مذکورہ بالا صورت حال کے پیش نظر امیر امان اللہ خان کو غلط فہمی ہوگئی تھی، تبھی اس نے افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا تھا۔ یہ آویزش اُن روابط اور گفت و شنید کے نتیجے میں پیدا ہوئی جو ہندوستانی عوام کے غیر ذمہ دار نمائندوں اور افغانستان کے ذمہ دار افسران کے مابین جاری رہی تھی اس دوران دہلی اور کابل کی حکومتوں کے درمیان خط و کتابت بھی چلتی رہی۔

تیسری اینگلو افغان جنگ

سرحدوں پر جو افغان دستے متعین تھے وہ ہندوستان کے عوام کی زبوں حالی اور بے قراری سے بہ نسبت اُن افغانوں کے زیادہ باخبر تھے۔ جو درون افغانستان رہ رہے تھے۔ خیبر کی طرف جہاں بدقسمتی سے دونوں حکومتوں کی جانب سے حد فاصل طے نہیں کی گئی تھی۔ ایک افغان دستہ دفاع کی غرض سے ایک پہاڑی پر چڑھ گیا جسے لنڈی کوتل کے ہندوستانی افسروں نے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ لنڈی کوتل سے ایک پارٹی معاملے کو نمٹانے کے لئے کابل پہنچی اور اسکی اعانت کے لئے ایک ہوائی جہاز بھی پہنچا۔ افغان حکومت نے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ جہاز حملے کی نیت سے آیا ہے بمباری شروع کردی جس کے جواب میں انگریزوں کی طرف سے بھی بمباری ہوئی۔

اعلانِ جنگ

اس چپقلش کے نتیجے میں اعلانِ جنگ ہوگیا۔ افغانی فوج نے لنڈی کوتل پر بمباری کی۔ انگریزوں نے اپنی فوج کو پیش قدمی کے لئے حکم دیا۔ ۳ر مئی ۱۹۱۹ء کو سکھ رسالے اور افغان رسالے کا آپس میں ٹکراؤ ہوا مگر مخالف سمت سے شدید بمباری ہونے کی بنا پر سکھوں کو لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد نادر خان نے ٹل کی طرف کوچ کیا .... قندھار کی جانب سے سردار قدوس خان نے بڑھ کر بلوچستان میں ورود کیا مگر اُس نے یہ نہ سوچا کہ قلعۂ جدید کی طرف سے انگریزی فوج بھی پیشقدمی کرسکتی ہے۔ انگریزی فوج نے قلعۂ جدید کے بعد فرنٹیئر پوسٹ کو فتح کرلیا۔ یاد رہے کہ قلعۂ جدید کے مقام پر سکھوں اور انگریزوں نے بڑی جدوجہد اور بہادرانہ دفاع کا مظاہرہ کیا تھا۔

امن کی تیاریاں

افغان حکومت نے ایک نمائندے کے ذریعے اینگلو انڈین حکومت کو تسلّی دی کہ افغانستان کی طرف سے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اور یہ سب کچھ محض غلط فہمی کی بنا پر رونما ہوا۔ اب دوبارہ دونوں حکومتوں کے مابین دوستی کی فضا پیدا ہونی چاہیئے۔ اینگلو انڈین حکومت کے فارن سیکریٹری سے بات چیت کی گئی۔ آخر افہام وتفہیم سے یہ طے پایا کہ جنگ بند کردی جائے۔
اس معاملے کو افغان کونسل میں زیر بحث لایا گیا۔ بہت دیر تک گرم اور طویل بحث جاری رہی۔ انجام کار امن خواہ گروہ کا پلّہ بھاری رہا۔ اس کے بعد دونوں حکومتوں کے مابین خط وکتابت چلتی رہی جو صلح نامے پر منتج ہوئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ راولپنڈی کے مقام پر دونوں حکومتوں کے وفود اکٹھے ہوں گے

اور باہمی گفت وشنید سے معاہدہ امن وآشتی کی شرائط طے کریںگے۔

معاہدۂ راولپنڈی

خود ڈاکٹر صاحب معاہدہ راولپنڈی (۸ اگست ۱۹۱۹ء مطابق ۱۱ ذیلقعد ۱۳۳۷ھ) کے متعلق لکھتے ہیں: [۱]

افغان کونسل نے اپنے ممبروں میں سے ہی مندرجہ ذیل نمائندے معاہدہ راولپنڈی کے لئے چنے۔

(۱) سردار علی احمد جان (وزیر مملکت برائے امورِ داخلہ وسربراہِ وفد)
(۲) ملاّ غلام محمد خان (وزیرِ تجارت)
(۳) سردار محمد یونس خان (سابق گورنر قندھار)
(۴) سردار عبدالعزیز خان (سابق افغان ایجنٹ برائے دہلی)
(۵) دیوان نارنجن داس (محکمہ مال کا ایک کلیدی عہدے دار)
(۶) میں خود (اُن دنوں میں دارالتالیف والتصنیف کا سربراہ تھا۔)
(۷) منشی غلام محمد خان (چیف سیکرٹری وزارتِ خارجہ)

اینگلو انڈین ڈیلیگیٹ مذکورہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔

(۱) سر ہملٹن گرانٹ (صوبۂ سرحد کا چیف سیکرٹری وسربراہِ وفد)
(۲) سر جان سیفی
(۳) جنرل نویرے
(۴) نواب سر شمس شاہ آف قلاّت (بلوچستان)

ہم دونوں وفود راولپنڈی میں جولائی ۱۹۱۹ء کے آخر میں جمع ہوئے اور صورتحال پر بحث کی ـــــــــــــــ

برطانوی حکومت کا افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کرنا۔

سر ہملٹن گرانٹ پوزیشن سمجھ گیا اور اس نے عقلمندی سے اور

---

[۱] اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان، جلد چہارم صفحہ ۱۳

رضامندی سے ہتھیار ڈال دیئے۔ حکومتِ برطانیہ نے افغانستان کے وہ تمام علاقے خالی کر دیئے جن پر انگریزی افواج نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی طرح افغان افواج کو ان برطانوی چوکیوں سے واپس بلا لیا گیا جن پر انہوں نے تسلط جمایا ہوا تھا۔ برطانوی حکومت نے امن حاصل کر لیا اور افغانستان نے جنگی آزادی حاصل کر لی۔ دونوں نے وہ کچھ حاصل کر لیا جسکی دونوں کو ضرورت تھی اور جو کچھ پہلے حاصل نہیں ہو سکا تھا ---------------

سید رسول[۱] نے اس عہد نامے کی چودہ شقیں شمار کی ہیں .....

RHEA TALLEY STEWART [۲] نے لکھا ' امان اللہ نے علی احمد جان کو اختیار دیا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق معاہدے کو منتج کرے۔ اگر افغانستان کے سابقہ فرمانرواؤں میں سے کوئی ہوتا تو وہ اس اختیار کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھتا۔ لیکن اس نے علی احمد کو ہدایت کی کہ ایک نکتہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ علی احمد جان جو کچھ دیگر قربان کر آئے اسکی پرواہ نہیں مگر ایک چیز ضرور جیت کر للئے اور وہ ہے افغانستان کی مکمل آزادی ....

امان اللہ نے جو وفد مقرر کیا اس میں ایک ہندو نائن داس بھی تھا۔ اس پر گرانٹ نے کہا 'یہ نہایت حیران کن تقرری ہے خصوصاً افغانستان جیسے ملک سے جہاں ہندوؤں کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے ------ امان اللہ کا پرانا استاد جسے اس نے قید سے رہا کیا' ہندوستان کا تربیت یافتہ ڈاکٹر عبدالغنی اور ایک باتونی فوجی جس کا نام کرنل غلام محمد تھا وفد کے دیگر اراکین تھے۔'

عبدالحئی حبیبی کا بیان ہے کہ ' ڈاکٹر عبدالغنی تحریک مشروطیت

---

۱ ' نگاہے بہ سلطنت امانی ' صفحہ ۵۵ یا ۶۲
۲ 'Fire in Afghanistan' P 79-80

کے سلسلے میں اپنے بھائیوں اور پروفیسر مولوی محمد حسین جو کہ امان اللہ خان کے دور میں ابتدائی سکولوں کا ناظم تھا، کے ہمراہ امیر حبیب اللہ خان کے ہاتھوں ارگ شاہی میں محبوس رہے تا آنکہ امان اللہ خان کے عہد میں ان سب کو رہائی ملی اور ڈاکٹر عبدالغنی کو معاہدہ راولپنڈی کے سلسلے میں علی احمد جان کی معیت میں راولپنڈی بھیجا گیا۔[۱]

ڈاکٹر صاحب نے ۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو عبدالرؤف بن مولوی فیروزالدین کو ایک خط میں لکھا 'پنڈی وہ مقام ہے جہاں مجھے اللہ تعالیٰ نے مخالف پارٹی کو مرعوب کر کے اس پر فتح مبین عطا فرمائی۔ اس وقت بھی میں اب جیسا بے سروسامان تھا۔'

ایک یورپین مورخ نے لکھا 'افغانستان کا نیا والی امان اللہ خان بحیثیت ایک قومی اور خلاف برطانیہ لیڈر مشہور ہونے پر اپنے دیس میں معاشرتی و اقتصادی اصلاحات کرنے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے ملک کے قدامت پسند اور مذہبی طبقے کی مخالفت مول لی۔ کچھ تو ملک کے اندر کی بے چینی کی بناء پر جو حکومت برطانیہ کیساتھ افغانوں کے مخالفانہ جذبات رکھنے سے پیدا ہوئی اور کچھ نئے امیر کے اس اندازے کی بناء پر کہ ہند میں برطانوی راج کیخلاف قومی انقلاب آنے والا ہے اس نے سن ۱۹۱۹ء میں برطانوی فوجوں پر حملہ کر دیا جسے تیسری اینگلو افغان جنگ کا نام دیا جاتا ہے۔ افغان حکومت کو اس جنگ میں پوری کامیابی نہ ہو سکی اگرچہ اسے پشتون علاقے میں مہم جو جرنیل نادر خان جو کہ ایک مہمند سردار تھا کے ہاتھوں کچھ کامیابی ہوئی۔ آخر جب جون ۱۹۱۹ء میں امان اللہ خان نے صلح کرنی چاہی تو جنگ عظیم سے تھکے ہوئے انگریزوں نے اس شدید تھکاوٹ کی بناء پر اور کچھ اس بناء پر کہ ہندوستان میں سیاسی بے چینی روز بروز بڑھ رہی تھی افغانستان کو خارجی تعلقات کے معاملے میں آزادی دے دینے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور اس طرح معاہدہ راولپنڈی کے ذریعے افغانستان کو پہلی

---

[۱] 'جنبش مشروطیت در افغانستان'، صفحہ ۶۳

یار دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے مکمل آزادی مل گئی۔

امان اللہ خان مخالفت برطانیہ کی رو کے ذریعے لوگوں میں ہر دلعزیزی کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔ ان جذبات میں حکومت روسیہ کی اس حمایت ذنائید سے بھی بڑی مدد ملی جو وہ ہندوستان کے انقلاب خواہوں کی جدوجہد کے سلسلے میں کرتی رہی ہے۔[1]

تعلیم

: کابل میں جدید تعلیم کی پیش رفت کی بابت پہلے کچھ ذکر کیا جا چکا ہے۔ امیر امان اللہ خان کے عہد کے ابتدائی حصے میں حبیبیہ اسکول کی حالت تسلی بخش نہ تھی اور افغانوں اور انگریزوں کی جنگ کے شور و غل کی وجہ سے اس میں حاضری کا معیار بھی بہت گر گیا تھا، لیکن جب سردار سلیمان خان سابق گورنر ہرات بحیثیت وزیر معارف مقرر ہوا تو اُس نے تعلیمی امور میں بڑی دل چسپی لی اور اس شعبے میں بڑی محنت اور کوشش کا مظاہرہ کیا مگر چونکہ اس وقت کابل میں کوئی ماہر تعلیم موجود نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹر صاحب بھی ہندوستان کو چلے گئے تھے اس لئے تعلیم کو ٹھوس بنیادوں پر استوار نہ کیا جا سکا۔ یہی سبب ہے کہ بعد میں جب نادر شاہ برسر اقتدار آیا تو اس نے ہندوستان سے علامہ اقبال اور علامہ سید سلیمان ندوی کو افغانستان کی نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کے لئے مدعو کیا۔

دار الترجمہ والتالیف

: یہ ادارہ جس کا مکمل نام "دار الترجمہ والتصنیف والتالیف تھا، ڈاکٹر صاحب کے زیر نگرانی امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں قائم ہوا تھا اور بعد میں نادر شاہ کے زمانے تک قائم رہا۔ اس ادارے کا کام تصنیف و تالیف، ترجمہ اور دیگر علمی و ادبی خدمات انجام دینا تھا۔ یہ ادارہ افغانستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے واحد ادارہ تھا۔ جس میں مقامی علماء و فضلاء کے علاوہ چند ہندوستانی گریجویٹ بھی سرگرم عمل تھے۔ ان گریجویٹ حضرات میں ڈاکٹر صاحب کے دونوں بھائیوں مولانا نجف علی خان عاصی اور مولوی محمد چراغ کے علاوہ پروفیسر محمد حسین جالندھری بی اے علیگ اور

---

[1] 'AREA HANDbook FOR AFGHANISTAN' 4th Ed: P52

مولوی مظفر خان بی اے اسلامیہ کالج لاہور بھی شامل تھے۔ ان سب نے قبلہ ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں اپنی گراں بہا علمی و ادبی خدمات سے افغانستان کی سرزمین کو مشرف کیا۔[1]

امیر امان اللہ خان جب تخت نشین ہوا تو اس نے ڈاکٹر صاحب کو رہا کرنے کے بعد نہ صرف اپنی لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا بلکہ دارالترجمہ والتصنیف کا پھر سے ڈائریکٹر بنا دیا۔

بعد میں مولانا نجف علی خان صاحب کو دارالترجمہ زالتالیف کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے الفاروقؓ سیرۃ النبیؐ اور مسدس حالی کے فارسی تراجم اسی ادارے کے زیر اثر کیے۔ مولوی محمد چراغ بی اے ریاضی اور تاریخ جغرافیہ کے مضامین مکتب حبیبیہ میں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس سکول کے پرنسپل ہو گئے۔ انہوں نے انسپکٹر آف سکولز کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیئے۔

پروفیسر محمد حسین جالندھری امیر امان اللہ خان کے عہد میں ابتدائی جماعتوں کی تعلیم اور نصابی کتب کے ڈائریکٹر رہے۔ عبدالحئی حبیبی نے لکھا کہ مولوی محمد حسین بسیار نویس تھے۔ انہوں نے ۷۵ کتب تصنیف یا تالیف کیں۔ ان میں سے ۱۳ ادارہ تصنیف والتالیف کی طرف سے چھپیں۔ مزید ۵ کتب کے تراجم مذکورہ ادارے نے ان سے کرائے۔ ۱۸ کتب انہوں نے امیر امان اللہ خان کو پیش کیں اور باقی کتب ہندوستان سے شائع ہوئیں۔ ان کی تالیف انقلاب افغانستان میں بھی کچھ حد تک داغدار جانبداری پائی جاتی ہے۔ تاہم ۲۵ برسوں کے احوال و واقعات پر محیط یہ کتاب متجسس محققین اور مؤرخین کے لئے وافر پُر مغز معلومات فراہم کرتی ہے۔[2]

---

[1] 'احوال و آثار مولانا نجف علی خان عاصی' صفحہ ۲۱

[2] 'جنبشِ مشروطیت' صفحہ ۲۹

مولوی محمد مظفر خان مروت بی اے علاقہ بنوں (صوبہ سرحد پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ ہند سے اپنی تعلیم مکمل کر کے کابل گئے اور مدرسہ حبیبیہ میں ریاضی اور جغرافیہ کی تدریس کرتے رہے۔ یہ مشروطہ تحریک کے سلسلے میں گرفتار ہوئے اور بلیگ کے عارضے سے جیل ہی میں وفات پا گئے۔

مشروطہ تحریک سے وابستہ کچھ افغان علماء و فضلاء نے بھی ادارۂ تصنیف و تالیف کی گراں مایہ خدمات انجام دیں۔ ان میں سے چند کا ذکر یہاں پر کر دیا جاتا ہے۔

محمد انور بسمل رسالہ' انجمن ادبی' کی ادارت کرتے رہے اور مدرسہ حبیبیہ میں درس و تدریس بھی کرتے رہے۔ قاری عبدالغنی خان سلیمان خیل اور عوندوال بھی حبیبیہ سکول میں سلامیات پڑھاتے رہے یہ ایک بہت بڑے عالم دین تھے۔ انہوں نے ادارۂ ترجمہ و تالیف کے لئے ابتدائی جماعتوں کی اسلامیات کی کتب مدوّن کیں۔ میر قاسم نعمانی 'سراج الاخبار' میں بھی کام کرتے رہے۔ چونکہ ان کے والد بھی جیّد عالم دین تھے، اس لئے میر قاسم نے علمی ماحول میں پرورش پائی۔ یہ سلامی علوم بشمول عربی پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ مدرسہ حبیبیہ میں بھی پڑھاتے رہے۔ امیر امان اللہ خان کے عہد میں اخبار امان افغان کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ان کی تصنیفات میں سماجی اخلاقی اور قانونی موضوعات بھی وافر مقدار میں ہیں۔

کاکا سید احمد خان لودین قندھاری فارسی عربی اور ریاضی کے علوم میں کثیر مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے ابتدائی جماعتوں کی تدریس کے لئے انوکھا سا طریقہ وضع کیا، جو کاکا طریقہ' تدریس' کے نام سے معروف ہوا۔ مولوی غلام محی الدین ٹیچرز ٹریننگ سکول میں پڑھاتے رہے۔ فارسی عربی پشتو، گرمکھی سنسکرت اور اردو پر انہیں اچھا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے ادارۂ ترجمہ والتالیف کے زیر اثر معرکہ مذہب و سائنس کا ترجمہ اردو سے فارسی میں ڈھالا۔

باب نہم

تحریکِ آزادی برّصغیر پاک و ہند

انڈیا انڈی پینڈینس لیگ (INDIA INDEPENDENCE LEAGUE) :

ڈاکٹر شیخ اقبال شیدائی کا ایک طویل مقالہ لاہور کے رسالہ 'نصرت' کی اشاعت مارچ ۱۹۷۲ء میں چھپا۔ اس مقالے کی گیارھویں قسط ملاحظہ ہو :

ڈاکٹر عبد الغنی خان ضلع گجرات پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہ امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں افغان حکومت کی ملازمت میں آئے۔ امیرِ مذکور نے انہیں حبیبیہ کالج کابل کا پرنسپل مقرر کیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے دو اور بھائی مولانا نجف علی خان اور مولوی محمد چراغ بھی کابل میں موجود تھے۔

ڈاکٹر صاحب کابل میں متعینہ روسی سفارت خانے کے عملے کو فارسی زبان بھی پڑھاتے تھے۔ مولانا نجف علی خان جو شہزادہ امان اللہ خان کے اتالیق رہ چکے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے دن گذار رہے تھے۔ امان اللہ خان ان دونوں بزرگوں مولانا نجف علی خان اور ڈاکٹر عبد الغنی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ دونوں بھائی مجھے بھی بہت مکرم تھے۔

امیر حبیب اللہ خان نے ان بھائیوں اور ان کے ساتھ مشروطہ تحریک کے بہت سے اشخاص کو افغان حکومت کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں قید کر رکھا تھا۔ جب امیر حبیب اللہ خان ۱۹۱۹ء میں جلال آباد میں قتل کر دیا گیا اور افغانستان کے نئے فرمانروا کی حیثیت سے امان اللہ خان کی تاج پوشی ہوئی تو اس نے ان بھائیوں کو رہا کر دیا۔ مولوی محمد چراغ تو پنجاب کو لوٹ آئے مگر مولوی نجف علی خان اور ڈاکٹر عبد الغنی کابل میں ہی ٹھہرے رہے

اُن دنوں خان عبدالغفار خان بھی کابل میں موجود تھے۔ ہم سب کابل میں ڈاکٹر عبدالغنی خان کی رہائش گاہ پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ہم نے ڈاکٹر عبدالغنی خان کی تحریک پر کابل میں ایک جماعت بنا رکھی تھی۔ جس کا نام انڈیا انڈی پینڈنس لیگ تھا۔ خان عبدالغفار خان اس کے صدر تھے جبکہ میں اس کا سیکرٹری جنرل تھا۔ پارٹی کے دوسرے اہم عہدے دار مولانا نجف علی، ڈاکٹر عبدالغنی، حاجی ترنگ زئی اور ایک نومسلم شخص شیخ عبدالحق تھے لیگ نے فیصلہ کیا کہ ایک وفد روس کو بھیجا جائے تاکہ انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند سے باہر نکالنے کے لئے اس سے مدد حاصل کی جا سکے۔ میں اس وفد کا سربراہ تھا۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے اس وقت کے روسی سفیر متعینہ افغانستان کے ساتھ ایک طرح کی دوستی قائم کر رکھی تھی اور انہوں نے اسے اپنے اعتماد میں لے رکھا تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ خود اس سفیر کی ترغیب پر ہی لیگ نے روس کو اپنا وفد بھیجنے کا ارادہ بنایا۔ جہاں تک خان عبدالغفار خان کا تعلق ہے تو لیگ کے فیصلے کے مطابق انہیں اس وقت تک کابل میں ہی ٹھہرنے کے لئے کہا گیا۔ جبتک کہ میں (یعنی اقبال شیدائی) روس سے واپس نہ آجاؤں، اور اگر ضرورت پڑے تو وہ (یعنی خان عبدالغفار خان) مہمند زئی قبیلے کے علاقے کو چلے جائیں۔ اور حاجی ترنگ زئی صاحب کے ساتھ قیام کریں۔'

مذکورہ بالا مضمون سے قارئین پر عیاں ہو جاتا ہے۔ کہ ہر چند ڈاکٹر صاحب نے روسی سفیر کو اپنے اعتماد میں لے رکھا تھا، برصغیر پاک و ہند کو برطانوی استعماری طاقت کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کی غرض سے تھا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے اور انڈیا انڈی پینڈنس لیگ کے نام سے بھی ہویدا ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی نہ فقط افغانستان کی آزادی کے لئے کوشاں تھے، بلکہ ہندوستان کو حریت دلانے کی مساعی کے سلسلے میں ایک اہم علمبردار تھے۔

آزادی کا دوسرا مقصد

ڈاکٹر صاحب جب اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے تو ان کی آئندہ

کی خدمات کے سلسلے میں تین حکومتیں انہیں اپنی اپنی طرف کھینچے رہی تھیں۔ ایک تو اینگلو انڈین حکومت تھی جس نے انہیں سیکرٹری برائے وائسرائے ہند کے اعلےٰ عہدے اور ایک بڑی جاگیر کی پیش کش کرتے ہوئے انہیں ہندوستان ہی میں رہ کر ان کے ماتحت ملازمت کرنے کی ترغیب دی۔ دوئم ترکی کی حکومت ان کی اس جدّ و جہد کے پیش نظر جو وہ انگلستان کے قیام کے دوران ترکی کی حمایت میں کرتے رہے تھے انہیں ترکی میں آنے اور اس مملکت کی مزید خدمات انجام دینے کے لئے اصرار کر رہی تھی۔ سوئم افغانستان کی حکومت جس نے ان کی طالب علمی کے دوران ان کا برٹش سٹیٹ سکالر شپ بند ہو جانے پر ان کے بقیہ تعلیمی اخراجات برداشت کئے تھے خواہش مند تھی کہ وہ افغانستان کی خدمت کریں۔

ڈاکٹر صاحب کو چونکہ برطانوی استعماری طاقت سے مخاصمت تھی اور وہ برصغیر پاک و ہند کی دھرتی پر اس کے زبردستی قبضے پر کبیدہ خاطر تھے اور غلام ہند کی آزادی کے لئے بے چین تھے اس لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہند میں نہ رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے انگریزوں کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اور یہ سوچ کر انہوں نے ترکی کی بجائے افغانستان جانے کا ارادہ کر لیا کہ ترکی کے مقابلے میں افغانستان برصغیر پاک و ہند سے قریب تر ہمسایہ مسلمان ملک ہے اور افغانستان میں رہ کر وہ نہ صرف افغانستان کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے، وہاں جمہوریت کی داغ بیل رکھنے اور اُسے غیر ملکیوں سے آزادی دلانے کے لئے سعی کر سکتے ہیں بلکہ اس سرزمین سے خلافتِ ترکیہ کی حمایت و تائید جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند کو انگریزوں کے تسلط سے نجات دلانے اور اسے حریّت سے ہمکنار کرنے کے لئے بہتر طریق پر تدبیر کاری کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ترکی کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی وابستگی جواب اُتنی نہیں تھی جتنی کہ افغانستان اور ہندوستان کے معاملات کے سلسلے میں تھی تھوڑی سی بات کر لی جائے۔ ۱۹۱۸ء کے آخر میں جب امیر حبیب اللہ کی سالگرہ کے موقع پر اس

پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو عبدالرحمٰن نامی جس شخص کو فائرنگ کے کیس میں گرفتار کیا گیا کا باپ چونکہ تحریک جان نثاراں سے منسلک ہونے کی بناء پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پہلے ہی سے جیل میں تھا۔ اس لئے اس تعلق کو پیش نظر رکھ کر حاسد درانی سردار مستوفی الممالک مرزا محمد حسین نے امیر حبیب اللہ خان کو کہا کہ اس قاتلانہ حملے کے پیچھے ڈاکٹر عبدالغنی کا ہاتھ ہے اور اس نے امیر کو بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی پارٹی بہت پھیل چکی ہے اور بہت زیادہ زور پکڑ چکی ہے اور اس پارٹی کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد نہ صرف افغانستان میں بلکہ ہندوستان اور ترکستان میں سرگرم عمل ہے۔ [۱]

اب ہم اپنے سلسلۂ کلام کو پھر افغانستان اور ہندوستان کی آزادی کے موضوع کی طرف لوٹاتے ہیں۔ افغانستان میں رہ کر ڈاکٹر صاحب ایک پنتھ دو کاج کی ضرب المثل پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک پتھر سے دو پرندے مارنے کے خواہشمند تھے۔ وہ یوں کہ ینگ افغان پارٹی کے ساتھ مل کر وہ نہ صرف افغانستان کی اندرونی و بیرونی آزادی کے لئے کوشاں تھے اور بالآخر معاہدہ راولپنڈی (اگست ۱۹۱۹ء) کے وفد میں شامل ہو کر انہوں نے افغانستان کے استقلال کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔ بلکہ وہ امیر امان اللہ خان کی حکومت کی مدد سے اور روس کی حکومت کی طرف سے دباؤ دلوا کر برصغیر پاک و ہند کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانا چاہتے تھے۔

امان اللہ خان نے بھی حکومت روس کے ساتھ تعلقات اس لئے استوار کئے تھے۔ تاکہ وہ برطانوی ہند کی حکومت سے اُسے آزادی دلانے میں اسکی امداد کرے۔ بقول سید رسول امان اللہ خان اور ڈاکٹر عبدالغنی مارکسٹ یا کمیونسٹ نہیں تھے۔ وہ تو محض آزادی کے مقصد کے حصول کے لئے اس کے حلیف بنے [۲]۔ آج بھی اگر ایک مسلمان ملک روس کا طرفدار ہے اور دوسرا مسلمان ملک امریکہ کا ساتھی ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اول الذکر

---

[۱] اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچویشن ان سینٹرل ایشیا، صفحہ ۷۹

[۲] نگاہے بر عہد سلطنت امانی، صفحہ ۵

کمیونسٹ ہوگیا ہے۔ اور بعد الذکر کیپٹلسٹ ہوگیا ہے۔ یہ عارضی طرفداریاں تو سیاسی مفادات کے لئے کی ہی جاتی ہیں۔

امیر امان اللہ خان سے برصغیر کے مسلمانوں کی اُمیدوں کی وابستگی

امیر امان اللہ خان فرمانروائے افغانستان پر برصغیر کے مسلمانوں نے حصولِ آزادی کے لئے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ عزیز ہندی نے لکھا "امان اللہ خان مشرقِ وسطیٰ کا ایک ہونہار حکمران ہے......... ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں امان اللہ خان کو بہت پسند کرتے میں وہ سمجھتے ہیں کہ امان اللہ خان ایک قابلِ رشک شخصیت اور لازوال شہرت کا مالک ہے......... افغانستان آزاد ہوکر دنیا میں معزز بنے گا اور پھر وہ برصغیر کی آزادی کے لئے کوشاں ہوگا۔ [1]

سید رسول کا کہنا ہے کہ ہند کے مسلمان اس امید کی بنا پر جو وہ امان اللہ خان پر رکھتے تھے کابل کو دارالسلام اور امان اللہ خان کو خلیفہ پکارتے تھے افغانستان کے اس حکمران نے بھی انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے ہند کے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ ہجرت کرکے افغانستان پہنچ جائیں۔ [2]

علامہ اقبال اور مولانا نجف علی خان نے علی الترتیب پیام مشرق اور تحفہ امانیہ میں اعلیحضرت غازی امان اللہ خان کو اسکی اس ہردلعزیزی پر خراجِ عقیدت پیش کیا جو اسے افغانی عوام کو استقلال کی نعمت سے سلطنت آشنا کرنے اور ہندوستانی لوگوں کو برطانوی حکومت کے شکنجے سے آزادی دلانے کے قولی و فعلی اقدامات کرنے کی بناء پر اسے ملی۔

پیامِ مشرق کے چند ایسے توصیفی اشعار ملاحظہ ہوں:

---

[1] زوالِ غازی امان اللہ، صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸

[2] نگاہے بہ عہد سلطنت امانی، صفحہ ۵

اے امیر کامگار اے شہریار	نوجواں و مثل پیراں پختہ کار
چشم تو از پردہ گیہا محرم است	دل میان سینہ ات جام جم است
عزم تو پایندہ چوں کہسار تو	حزم تو آساں کند دشوار تو
ہمت تو چوں خیال من بلند	ملت صد پارہ را شیرازہ بند
ہدیہ از شاہنشہاں داری بسے	لعل و یاقوت گراں داری بسے
اے امیر ابن امیر ابن امیر	ہدیہ از بے نوائے ہم پذیر

ترجمہ :-

در پیش مقصد کو پالینے والے اے فرمانروا! تم نوجوان ہو کر بوڑھوں اور بزرگوں کا سا پختہ تجربہ اور متانت رکھتے ہو۔

اے امیر! یہ تمہاری چشم بینا کی اہلیت سے ہی تو ہے کہ دہ کئی پردوں میں سے جھانک کر آئندہ کے راز معلوم کر لیتی ہے اور پھر اس کے مطابق آئندہ کی قومی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ گویا تمہارا دل جمشید بادشاہ کے اس مخصوص پیالے کا سا ہے جس میں وہ ایک نظر ڈال کر دنیا کے حالات سے آگاہ ہو جاتا تھا۔

تمہارے ارادے تمہارے ملک کے پہاڑوں کی طرح مضبوط ہیں تمہاری احتیاط کاری اور تدبیر سازی تمہارے راستے میں حائل تمام مشکلات کو رفع کر دیتی ہے

مجھ شاعر کی طرح جو بلند پرواز خیالات رکھتا ہے تمہارا حوصلہ و ہمت بہت بلند اور اعلیٰ ہے۔ مختلف قبیلوں میں بٹی ہوئی قوم کے لئے تیری ذات فرشتۂ رحمت ثابت ہوئی اور تو نے ان منتشر لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔

تمہاری قابلیت اور شجاعت سے مختلف ممالک کے حکمرانوں کی طرف سے تمہیں ہدیہ تبریک مل رہا ہے۔ تمہارا ملک لعل و یاقوت جیسے قیمتی موتیوں سے مالا مال ہے

اے امیر امان اللہ خان بن امیر حبیب اللہ خان بن امیر عبدالرحمان خان مجھ بے نوا اور ہیچمدان اقبال سے بھی اس نظم کی صورت میں ہدیہ تہنیت قبول فرمائیے۔ (ترجمہ ختم)

تحفۂ امانیہ میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایا فرزندِ شاہِ کشور آرا — کہ یادا جنت الماواش ماوا
سراجِ ملت و دینِ یگانہ — کہ شد نیر شہادت را نشانہ
جزا ر لطفِ حق بادا مقامش — بہ نیکی زندہ بادا نیک نامش
ایا اے زادۂ عصمت مآبے — جنابِ حضرتِ علیا خطابے

....

مبادا سایہ اش کم از سرِ تو — دعائش باد یار و یاورِ تو

....

رعیت پرورے لشکر نوازے — زمیں بیچارگاں را چارہ سازے
حلیم و بردبار و با تحمل — بری از شیوۂ جاہ و تجمل
بر افرادِ رعایا مہربانے — نکو طینت نکو محضر جوانے
شہے کش امرہم شوری ست رہبر — براہِ سنتِ صدیق اکبرؓ

....

شہے کو خیرِ ملت راست ساعی — چناں کز بہرِ رمۂ خویش راعی
شہے کو صیدِ دلہائے رعیت — کند با دانۂ لطف و مروت
ایا شاہ جوان بخت جواں سال — الٰہی در جہاں باشی باقبال
چو در عہد شہ خلد آشیانی — بدستت بُد عنانِ حکمرانی
ہمے گشتی تو اندر کوئے و بازار — بہ تبدیلِ لباس اندر شبِ تار
کہ تا جویا شوی ز احوالِ مردم — ز بہرِ حفظِ جان و مالِ مردم
برین بیداریت صد آفریں باد — بصیر و ناصرت جان آفریں باد

....

رعیت گلہ و تو گلہ بانی — بجا آور بجاں فرضِ شبانی

....

بجاں کوش از پئے بہبودِ ملت   کہ ملت ہست تکیہ گاہِ دولت

پئے ملت ز بہر خیر خواہی   رفیقت باد توفیقِ الٰہی

ترجمہ ۔

مولانا نجف علی خان عاصی نے اعلیحضرت امیر امان اللہ خان کی تخت نشینی کے موقع پر اسے مبارک باد پیش کرتے ہوئے یہ طویل نظم اپنی حالتِ حبس میں ارگِ شاہی کابل سے لکھ بھیجی۔

سلطنتِ افغانستان کو سنبھالنے اور سنوارنے والے شہنشاہ حبیب اللہ خان کے اے فرزند! اللہ کرے شہنشاہ مرحوم کا ٹھکانا جنتِ ماوا بنا ہو۔

شہنشاہ مرحوم جو شہادت کے تیر کا نشانہ بنا تھا، اللہ کرے مرحوم کا مقام اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کے قرب میں ہو اور نیک نامی میں اس کا نام زندہ رہے۔

عفت مآب ماں جس کا خطاب علیا حضرت ہے کے بیٹے! خدا اپنی ماں کا سایہ تمہارے سر سے دور نہ کرے اور اسکی دعائیں تیری معین و مددگار ہوں۔

تو ایک رعیت پرور سلطان ہے اور عساکر کو نوازنے رہنا تیرا شعار ہے اور بے چاروں کے لئے تو ایک چارہ ساز کی حیثیت رکھتا ہے۔

تو بہت صاحب حلم اور بڑا متحمل و بردبار ہے اور شان و شوکت اور کروفر کی خوبو سے مبرا ہے۔

اے شاہ! تم عوام الناس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے والے ہو اور نیک طبیعت اور اچھی فطرت کے مالک ہو۔

تم نے مجلسِ شوریٰ بنا کر حضرت صدیق اکبرؓ کے اس دستور کہ مسلمان باہمی صلاح مشورے سے اپنے معاملات حل کرتے ہیں، سے رہبری حاصل کی ہے۔

تو ایسا بادشاہ ہے جو ملت کی بھلائی کے لئے کوشاں ہے اور یہ روش اس طرح ہے جس طرح ایک چرواہا اپنے ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے اور اس کا ہر طرح سے خیال

رکھتا ہے۔ تو ایسا والی ہے جو محبت کے ساتھ مہربانی ولطف کر کے اس کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔

اے جواں بخت اور نوجوان شاہ! اللہ کرے نوجہاں میں بااقبال رہے۔

حیث شہنشاہ شہید (حبیب اللہ خان) جس کا ٹھکانا اب جنت میں ہے کا زمانہ تھا اور اس نے تمہارے ہاتھ میں حکمرانی کے کچھ اختیارات دے رکھے تھے تو تم اندھیری راتوں کو بھیس بدل کر گلیوں اور بازاروں میں پھرتے رہتے تاکہ لوگوں کے جان ومال کی حفاظت کے پیش نظر ان کے حالات سے آگاہی پاسکو۔

تمہاری اس شبِ بیداری پر تمہیں آفرین اور شاباش ہو اور جان عطا کرنے والا اللہ تعالےٰ تمہاری مدد و نصرت کرے۔

رعایا ریوڑ کی مانند ہے اور تو اس کا رکھوالا ہے تمہیں چاہیئے کہ ایک رکھوالا ہونے کے ناطے تم اپنے فرض کو دل وجان سے نبھاؤ۔

عوام کی بہتری کے لئے دل سے کوشاں رہو کیونکہ سلطنت کی ترقی کا دارومدار عوام پر ہوا کرتا ہے۔

میری دعا ہے کہ ملت کی اس تمام خیر خواہی کے بارے میں خداوند تعالےٰ کی توفیق تمہارے شاملِ حال رہے۔ (ترجمہ ختم)

غازی امان اللہ کے ہاتھوں افغانستان کو استقلال (آزادی) مل جانے پر اہل ہندوستان کے دلوں میں غلامی کی زنجیریں توڑ دینے اور آزادی کے شربتِ روح افزا سے اپنے روحی اضطراب کو تسکین دینے کے لئے ایک زبردست ہیجان امڈ آیا اور ان کے قلوب و اذہان کی اسی متلاطم کیفیت کے نتیجے میں ہندوستان میں بہت سی سیاسی تنظیمیں اور انقلابی تحریکیں رونما ہونے لگیں۔ عزیز ہندی نے ہندوستان کے ان گنت نفوس کی بے چینی و اضطرار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

جنگ عمومی کے خاتمے پر جبکہ ہر ایک افتادہ و محکوم قوم اپنی غلامی کے طوق سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا تھا یہاں کے باشندوں میں بھی وہی تڑپ پیدا ہوگئی تھی۔ ٹھیک اس وقت میں ان کے ہمسایہ ملک جو اس وقت تک محض گمنامی کی حالت میں اپنی زندگی کے ایام بسر کر رہا تھا۔ اپنی آزادی کے حصول و دفاع کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے اور برطانیہ جیسی پرعظمت و ہیبت طاقت سے جو ابھی ابھی ایک خوفناک عدو پر غلبہ اور فوقیت حاصل کر چکی تھی، سر ٹکراتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس غیر متوقع اور ان ہونی کامیابی کا ہندوستانی دل و دماغ پر بھی اثر پڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہند میں مختلف قسم کی تحریکات انہی ایام میں زور و شور سے ابھریں۔ ؏۱

جس طرح آج پاکستان کی آزادی و بقاء کے لیے آزاد اور مضبوط افغانستان کی اشد ضرورت ہے۔ اس طرح اس زمانے میں یعنی جنگ عظیم اول کے خاتمے کے زمانے میں جبکہ افغانستان اور برصغیر کی آزادی کے لئے حالات کچھ موافق تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے حصول کے لئے استقلال یافتہ اور مستحکم افغانستان کی بڑی ضرورت تھی۔

ذیل میں ہم ڈاکٹر صاحب کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب "اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچوئیشن ان سینٹرل ایشیا" جو ۱۹۲۱ء میں طبع ہوئی کے کچھ حصوں کا ترجمہ پیش کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خیالات اور ان کی پیش کردہ آراء جان سکیں۔

وسط ایشیا کی سیاسی صورتحال

اپریل ۱۹۱۹ء میں جب میں ارگ شاہی کابل سے نکل کر آزاد اور پر رونق دنیا میں آیا تو میں نے دنیا کو الٹ پلٹ پایا کیونکہ ہر جگہ افراتفری اور انقلاب برپا تھا۔۔۔۔۔۔ ہندوستان کے سیاسی تصور میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی تھی کوئی شخص بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی قوم کو حصول

؏۱ زوال غازی امان اللہ (انقلاب افغانستان ۱۹۲۸ء) صفحہ ۵۶، ۵۷)

آزادی کی خواہش رکھنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ قوم کسی خارجی حکومت کے زیر تسلط کتنی ہی مطمئن اور خوش کیوں نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہر حال یہ بات افسوس ناک ہے کہ ہمارے ہمسایہ ممالک میں آزادی کے سلسلے میں برصغیر ہند کے لوگوں کی جد و جہد کو غلط رنگ دیا گیا ہے اور اس غلط رنگ دینے کی بنا پر ہی وہاں برصغیر کے لوگوں کے ساتھ گہری ہمدردی پیدا ہو گئی ہے ۔ میں (عبد الغنی) سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا عمداً غلط رنگ دینا اور پھر اس سے غلط فہمی پیدا کرنا ایک جرم ہے کیونکہ غلط فہمیوں سے پرانے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور دوست دشمن میں بدل جاتے ہیں ؛ (صفحہ ۱)

ہو سکتا ہے کہ انتہا پسند حضرات مجھے نشانۂ ملامت بنائیں مگر ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے مجھے پورا حق ہے کہ میں اپنے نظریات کا اظہار کروں اور مجھے امید ہے کہ میری باتیں سنے بغیر وہ مجھے برا بھلا نہیں کہیں گے ۔ میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیالات اور مشورے پیش کرنے میں میرے اندر برصغیر ہندوستان کے مستقبل کی بہتری کے شدید احساس کے سوا کوئی اور محرک نہیں ہے ۔ (صفحہ ۲)

گذشتہ صدی کے آخری عشرے کی بات ہے جب میں انگلستان میں زیر تعلیم تھا مجھے دار العوام (HOUSE OF COMMONS) میں ایک غم افزا اور دردناک تماشا مشاہدہ کرنے کا اتفاق ہوا ۔ وزیر برائے معاملاتِ ہند کو پیہم درخواستوں کے بعد امورِ ہند سے متعلق سوالات کرنے کے لئے صرف ایک دن مرحمت ہوا ۔ دار العوام میں اس دن مشکل ہی سے بیس ارکان موجود تھے ۔ ان میں سے بھی کچھ ارکان اونگھ رہے تھے ۔ صرف چند تقریریں ہوئیں اور ان تین سو ملین نفوس کے نصیبے کو سربمہر کر دیا گیا ۔ جن کے شب و روز کے خون پسینے کی محنت سے برطانیہ کے خزانے معمور ہو رہے تھے اور جن کی محنت شاقہ سے ہندوستان برطانوی تاج کا ایک نہایت قیمتی نگینہ ثابت ہو رہا تھا اور جن کی شمشیر براں سے اور جن کے لہو سے ہندوستان کے باہر بھی برطانوی افواج کے لئے کامیابیاں حاصل کی گئی تھیں ۔ حیف کہ برطانوی

عوام اور ان کے نمائندوں نے ہندوستان کے معاملات میں بہت ہی کم دلچسپی دکھائی ۔

(صفحہ ۳)

" اب جبکہ افغانستان اور اینگلو انڈین حکومت کے مابین کشیدگی پائی جاتی ہے ۔ تو میں نے سوچا کہ اگر میں وسط ایشیا کی سیاسی صورت حال پر کچھ روشنی ڈالوں تو یہ مفید بات ہو گی کیونکہ میں نے نہ صرف افغانستان اور افغانی دربار کے معاملات کو نزدیک سے دیکھا ہوا ہے بلکہ ایک سال تک باشوک سفارتخانے کے ساتھ میرا قریبی رابطہ رہا ہے ۔"

(صفحہ ۵)

" افغانستان مستقبل قریب میں اینگلو انڈین حکومت پر تنہا حملہ آور ہونے کی تمنا کرنیکی سوچ بھی نہیں سکتا بشرطیکہ اسمیں ذرا بھی سوجھ بوجھ ہو ۔ ہاں وہ ایسی مہم کا ارادہ تب کرے گا جب اس کا خزانہ بھرا ہوا ہو گا اور اس کے عساکر اچھی طرح اور جدید طرز پر تربیت یافتہ ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ وہ منظم اور اسلحہ سے لیس ہوں گے اور ملک کے وسائل پوری طرح بروئے کار آئے ہوں گے اور اسکی آبادی کا ہر پانچواں مرد اپنے تعلیم یافتہ ہونے پر فخر کرے گا اور مسلح ہو کر مادر وطن کے دفاع کے لئے ڈٹ جائے گا ۔

جہاں تک روس کا تعلق ہے تو برطانوی ہند پر تنہا حملہ کرنے کیلئے وہ ہچکچائیگا تا آنکہ وہ اپنی فوجی طاقت برطانیہ کی فوجی طاقت سے دگنا کرلے ۔ اس لئے اگر وہ کبھی ہند پر حملہ آور ہونے کی تمنا کرے تو اسے پہلے افغانستان کا تعاون ضرور حاصل کرنا ہو گا مگر ایسے افغانستان کا تعاون جو اپنی کمزوری رفع کر چکا ہو اور خوب منظم اور مستحکم بن چکا ہو ۔

ہندوستان کے اندر دو نظریے چل رہے ہیں ۔ ایک تو ہے برطانوی ہند کی حکومت کا نظریہ جو کہ یقیناً اور تمام تر برطانوی مفادات کو پیش نظر رکھے ہوئے ہے اور دوسرا نظریہ ہے برصغیر ہندوستان کے عوام کا جو باقی تمام مفادات کی نفی کر کے فقط اپنے مفادات کو مد نظر رکھے ہوئے ہے ۔ . . . . . ہندوستانیوں

اور برطانوی ہندوستان کی حکومت کے درمیان اختلافات کی خلیج جو وسیع تر ہوتی چلی جارہی ہے اس سے مجھے بہت دکھ ہے۔ یہ خلیج کیوں پیدا ہوئی ہے اور یہ کیوں پیدا ہو؟ اس کا جواب برطانوی ہندوستان کی حکومت دے۔ میں تو تنہا اسی کو اس کے لئے موردِ الزام ٹھہراتا ہوں۔

ہندوستانی عوام اب اتنے سمجھدار ہو چکے ہیں کہ وہ جان سکیں کہ برطانیہ نے یہ جو ہندوستان کو فتح کیا تھا تو ایک تجارتی کمپنی کے تحت تجارتی ملحوظات کو سامنے رکھ کر فتح کیا تھا اور جب اس کا انتظام آتنا وسیع ہو گیا کہ کمپنی سے سنبھالا نہیں جا سکتا تھا تو یہ تاج برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس وقت بھی برطانیہ کی حکومت کے سامنے تجارتی ملحوظات تھے اور اب بھی ہیں بلکہ اب ان ملحوظات سے کچھ زیادہ ہی پیشِ نظر ہے اور اس کا واحد محرک یہ ہے کہ برطانوی قوم اور برطانوی حکومت خوب خوشحال ہو۔

برطانوی حکومت کو میں اگر یہ تجویز پیش کروں کہ موجودہ نازک حالات میں وہ کیا رویہ اختیار کرے تو شاید اسے دیدہ دلیری پر محمول کیا جائیگا مگر میں اپنے دل میں ہندوستان کا مفاد رکھتا ہوں اور میں یہ بات کہنے سے نہیں رہ سکتا کہ اینگلو افغان جنگ جیسا سخت اقدام کرنے سے پیشتر اسے دو بار سوچنا ہوگا اور اسی طرح ہندوستانی عوام کو اس اقدام کی مخالفت کرنے یا اسے سراہنے سے پہلے دو سے بھی زیادہ بار سوچنا ہوگا۔ کیونکہ اس سے ہندوستان کے مستقبل سے متعلق سب سے بڑے مسائل پیدا ہو جائینگے۔ اگر افغانستان کے ساتھ جنگ چھیڑ دی جائے تو ہندوستان کو بڑا گھاٹا رہیگا ....

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ نے تلوار اور حکمت عملی سے ہندوستان کو نہ صرف فتح کیا بلکہ اس فتح کو قائم بھی رکھا اور وہ مزید کچھ مدت تک اس قبضے کو قائم رکھ سکے گا۔ مادی لحاظ سے تو یہ قبضہ قائم رہیگا نہ معلوم کب تک مگر اخلاقی اعتبار سے وہ ایک مدت سے تنزل سے دوچار ہے۔ تجارتی ملحوظات کے لحاظ

سے بھی تاج برطانیہ کے نمائندوں کو چاہئے تھا کہ اپنے فائدے کی خاطر سہی دلوں کو موہ لینے والے خلق کا مظاہرہ کرتے مگر اسکی بجائے شاہی غنڈہ گردی استعمال کی گئی جس سے ہندوستان کے لوگوں کے دل برطانوی ہندوستان کی حکومت سے مکمل طور پر نفور اور دور ہو گئے۔ لوگوں کو طاقت کے بل بوتے پر دبا دینے والے اقدامات سے دل دوری کی خلیج بہت وسیع اور گہری ہو گئی ہے اور بادی النظر میں اس سے انگریزی حکومت کا ہندوستان میں مزید قیام بہت تھوڑا دکھائی دے رہا ہے۔ برصغیر ہندوستان کے لوگوں کے دل جو پہلے ہی سے برطانوی حکمرانوں پر عدم اعتماد کی وجہ سے بہت حساس ہو چکے ہیں دل برداشتگی کی بنا پر یا محض تبدیلی چاہنے کی بنا پر کسی بھی خارجی حملے کو فوراً قبول کر لینے اور اُن حملہ آوروں کا استقبال کرنے کے لئے آمادہ ہیں بلکہ آگے بڑھ کر کسی خارجی طاقت کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے اور اسکی امداد کرنے پہ مائل ہیں۔ یا پھر ملک میں قرانفری پیدا کرنے کی طرف راغب ہیں تاکہ برطانوی ہند کی حکومت اگر خارجی حملہ آور سے ہندوستان کو بچانے کے لئے کوئی دفاعی یا جارحی اقدام کرے تو اسے سبوتاژ کیا جا سکے۔

(صفحہ ۷ تا ۱۰)

یہ بات بالکل عیاں ہے اور میں (عبدالغنی) سمجھتا ہوں کہ برطانیہ کے حکمران طبقے کے افراد بادل ناخواستہ اس حقیقت کا علم رکھتے ہیں کہ اجنبیت کی خلیج جو ہندوستانی حکومت اور ہندوستان کے لوگوں کے درمیان ہے بتدریج وسیع ہو رہی ہے اور اب تو چند سالوں سے یہ بڑی تیزی سے وسیع ہوئی ہے۔ آج مجھے یہ دکھائی دے رہا ہے کہ اگر تاج برطانیہ برصغیر پاک و ہند کی حکومت یہاں کے لوگوں کے حوالے کر دے تو یہ لوگ تاجِ برطانیہ کی طرف دوستانہ انداز میں راغب ہوں گے اور یہ انگریزوں کا بجا اور صحیح احترام کریں گے نہ کہ جبر و اکراہ والا امارت پرستانہ احترام۔ ایک طرف سے یعنی حکومتِ برطانوی ہند کی طرف سے اس بلند خیالی والے شریفانہ رویّے کے مظاہرے کا فقدان ہے جو کسی مہذب قوم کی خصوصیت ہوا کرتا ہے اور ایسا منفی رویّہ شاید عمداً اور کسی مخصوص حکمت عملی

کے تحت ہے دوسری طرف سے یعنی اہل ہندوستان کے ایک طبقے کی طرف سے بے زبانی والی خوشامد اور اپنی خود داری کا جنازہ نکالنے والی تابعداری دیکھنے میں آ رہی ہے اور اس طرح کی خوشامد اور فرمانبرداری شاید اس طبقے کے خیال میں صلح جوئی کے لئے ضروری ہے اور اس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ مگر حکمرانوں اور محکوموں کے یہ دونوں طبقے مذکورہ بالا روش کا مظاہرہ کرنے میں اپنے اپنے مقام سے بہت نیچے گر گئے ہیں اور انہوں نے آپس کی غلط فہمیاں پیدا کر لی ہیں جس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے قومی مفادات کے خلاف طرز عمل اختیار کرتے رہے ہیں۔ اول الذکر طبقہ اپنی برتری اور فخرِ حکمرانی کے غلط زعم کے تحت ایسا کرتا رہا ہے جبکہ بعد الذکر طبقہ نادانی اور اپنے قومی نظریات کے زیر اثر ایسا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ بہر حال حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے گو ہمیں اسکی موجودگی سے ملال ہے۔ برصغیر کا ہر شخص اب اپنی ذمہ داری کے سلسلے میں کچھ حد تک بیدار ہو چکا ہے اور اب محسوس کرنے لگ پڑا ہے کہ اسے صلح جوئی کی اس جھوٹی صورت حال میں کیوں ڈال دیا گیا ہے۔ اینگلو انڈین حکومت اپنے رویے میں نرمی نہیں لا رہی اور بظاہر اسکی وجہ یہ ہے کہ اسے اپنی مادی طاقت کا بڑا گھمنڈ ہے۔ اسکی کچھ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسے ایسی نرمی کی تاثیر پر بھروسہ نہیں۔ اسکی کچھ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ برطانوی حکومت یہ خیال کرتی ہے کہ ہندوستانی لوگ اس نرمی سے غلط مطلب اخذ کریں گے وہ یہ کہ حکمرانوں نے ان سے مرعوب ہو کر یہ نرمی اختیار کی ہے اور یوں اس غلط مطلب سے محکوموں میں گستاخی پیدا تر آنے اور اپنی بات منوانے کا شدید جذبہ پیدا ہو گا۔ اسکی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حکمران طبقہ سمجھتا ہے کہ یہ نرمی دکھانے سے ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر اسکی عزت و وقار مجروح ہو سکتا ہے۔ حکمرانوں کے اس آخری خدشے پر مجھے ان سے ہمدردی ہے۔"

(صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸)

موجودہ صورت حال میں ... برطانوی حکام ... اور

ہندوستانی قوم کے باہمی تعلقات کا ایک اور پہلو نمودار ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستانی لوگوں کو برطانوی حکومت کی ضرورت ہے؟ یا آیا برطانیہ کو ہندوستان کی ضرورت ہے؟ ہندوستانی لوگوں کا سیدھا سادہ اور واضح جواب یہ ہے کہ ضرورت نہیں ہے۔ اس پر برطانیہ یہ ریمارک دے سکتا ہے کہ یہ کتنا بے ہودہ جواب ہے۔ برطانیہ اپنے آپ کو یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا میں ہندوستان کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ اسے جواب ملتا ہے "ہرگز نہیں" بلکہ اسے ہندوستانی لوگوں کے جواب پر تعجب ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ایسا جواب نہیں دینا چاہیے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ ...

... ہمارے ہندوستانی لوگوں کا ایک گروہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے قلم اور ہماری زبانیں مشین گنوں اور ہوائی جہازوں سے زیادہ خوفناک ہتھیار ہیں اور یہ کہ ہم برطانوی ناخوشی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے قلم اور زبانوں کو بروئے کار لاتے رہیں گے اور ہم ان دونوں معصومانہ اور موثر ذرائع سے پرامن انقلاب لانے کی کوشش کریں گے۔ میں اپنے ان حضرات سے حوصلے سے کام لینے اور بصیرت کو استعمال کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ میں انگلستان کی طرفداری نہیں کر رہا مگر میں اپنے ان ہم وطن حضرات کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انگلستان ان کی تقریروں کے سحر سے مسحور نہیں ہوگا اور ان کی تشدد کاری سے مرعوب نہیں ہوگا۔ میرے ہم وطنوں کو ایک بہت بڑی طاقت کا سامنا ہے جو سمجھ بوجھ میں بھی ان سے فائق ہے اور تدبیر سازی میں بھی برتر ہے اور اس کے وسائل بھی زیادہ ہیں۔ ایسی بڑی طاقت جس نے تمام دنیا کو مات کر دیا میرے ہم وطنوں سے بآسانی مات نہیں کھا سکتی خصوصاً ایسے ہم وطنوں سے جنہیں سہولت کے ساتھ فریب میں مبتلا کیا جا سکتا ہو۔ عدم تعاون ایک بڑا موثر ہتھیار ہے مگر عدم تعاون کی تنظیم کے حضرات کو سلیقہ اور بہتر استعمال کرنا ہوگا۔ ہمارے جن افراد نے ہجرت کی تھی ان کا اقدام عدم تعاون کا ہی مظاہرہ تو تھا۔ مگر یاد ہے کہ وہ مظاہرہ کس طرح انجام پذیر

اس سے مسلمانوں اور ہندوستان کے لوگوں کی عزت کو آنچ آئی اور عدم موالات کی تحریک کے اکابرین اور ہندوستان کے آزادی خواہوں کی نادر اندیشی کا ایک مضحکہ خیز تماشا سامنے آیا سورج اور چاند اور ستاروں نے ایثار اور ہجرت کرنے والی ان ہزار ہا نجیب روحوں کے ایک خستہ حال قافلے کو دیکھا کہ وہ کس طرح پشاور سے لیکر کابل تک پتھریلی سڑک کے ساتھ ساتھ افتاں وخیزاں چلتا گیا اور پھر افسوس اور عار محسوس کئے بغیر بلا خوفِ عقوبت الٹے پاؤں واپس آگیا اور اپنی ناکامی کے سلسلے میں سارا الزام افغانستان پر ڈال دیا۔ اس قافلے کی بے مرام واپسی سے اینگلوانڈین حکومت کی حکمت عملی کو مکمل فتح حاصل ہو گئی۔ اب تعلیمی معاملات میں عدم تعاون کا بھی وہی حشر نظر آرہا ہے اگر ہمارے لیڈر حضرات نے معاملہ فہمی سے کام نہ لیا تو وہ عنقریب عوام کا اعتماد کھو بیٹھیں گے اور پھر مستقبل قریب میں اس اعتماد کی بحالی دور از امکان ہو جائیگی۔ ہمارے زعماء کو چاہیئے کہ ایک قدم اٹھانے سے بیشتر اس کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور وخوض کر لیں اور اس سے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے وہ دیکھ لیں کہ آیا پہلا قدم خاطر خواہ طریق پر جاگزیں ہو چکا ہے کہ نہیں اب تک جتنا کام کیا جا چکا ہے اسکی انجام وہی کے پیچھے اگرچہ نہایت مخلصانہ محرّکات کارفرما رہے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ادائیگی سے پیشتر خوب سوچ بچار نہیں کی گئی تھی۔ جہاں تک میرے وطن کے عوامی لیڈروں کا تعلق ہے تو میرے دل میں ان کی بڑی تکریم ہے اور مجھے اُن سے بہت ہمدردی ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر اُس صورت میں ہندوستان کی سرزمین کے ایک نافرض شناس فرزند ہونے کا ٹھپہ نہیں لگا دینگے جب میں یہ نشان دہی کروں کہ جو کام اب تک پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے یا شروع تو کیا گیا مگر وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا عملی اعتبار سے نا پختہ منصوبہ بندی کا کھلا ثبوت ہے . . . .

جہاں تک روس کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیش قدمی کر کے

افغانستان میں داخل ہو جائے کیونکہ افغانستان اتنا مستحکم نہیں کہ وہ بالشویک پروپیگنڈے کی روک تھام کر سکے۔ اینگلو انڈین حکومت کی عدم دلچسپی اور سیاسی بصیرت کی کمی سے روس اس اہل ہو گیا کہ وہ راولپنڈی کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۹ء کے ثمرات سے فائدہ اٹھا سکے ...... بالشویک حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ انہیں علاقائی توسیع کی ہوس نہیں ہے بلکہ اصولی طور پر وہ علاقائی توسیع کے خلاف ہے۔

اس کے برعکس ان کا کہنا ہے کہ انکا اولین اور مقدس کام ان اقوام عالم کی مدد کرنا ہے جو کسی خارجی طاقت کے زیر تسلط ہیں خواہ ان کا استحصال ہو رہا ہو یا نہیں اور ان اقوام کو آزادی سے ہمکنار کرتا ہے جو سرمایہ داری نظام کے آمرانہ استحصال سے پس رہی ہیں خواہ وہ کسی بیرونی طاقت کے زیر تسلط ہوں یا نہ "

(صفحہ ۱۹۹ تا ۲۰۳)

" مجھے خدشہ ہے کہ برصغیر کے اینگلو انڈین حکمران برصغیر کے عوام کے مطالبات کو اغلباً پورا نہیں کریں گے اور حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان آویزش بڑھتی رہیگی جس سے اضطراب میں اضافہ ہوگا اور موجودہ خفیہ تنظیموں اور مخفی گروہوں کو اور بڑھاوا ملے گا .... اور حق خود اختیاری کے سلسلے میں برصغیر کے لوگوں کی مساعی زیادہ منظم اور زیادہ متحد ہو جائینگی "

(صفحہ ۲۱۸)

" ہند کی برطانوی حکومت اپنی اس پروردہ پالیسی پر چمٹی رہیگی کہ "طاقت میں سب کچھ جائز ہے" اور وہ مفلس عوام کو اس بات پر مجبور کریگی کہ وہ ان چھپے ہوئے خزانوں کو باہر لائے جنکا درحقیقت کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ ان خزانوں کو تو جنگ عظیم نے پہلے ہی ہڑپ کر لیا ہوا ہے "

(صفحہ ۲۲۱)

" افغانستان ترقی تو کرے گا مگر اغلب ہے کہ وہاں بادشاہت

ختم ہو جائیگی اور وہاں جمہوریت کی ایک خاص شکل جنم پائیگی۔'

(صفحہ ۲۲۱)

ہند کی برطانوی حکومت کو بالشویک حکومت کے اس پروپیگنڈے سے نہیں ڈرنا چاہیئے جو وہ ہند کے اندر کر رہی ہے مگر ہند کے سرحدی علاقوں میں اس پراپیگنڈے سے موثر طور پر پھیلی ہوئی جڑیں برطانوی حکومت کے لئے باعث تشویش ضرور ہیں مگر اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔.........

ہند ان سرحدوں کے قبائلی علاقوں کو اگر اس سرمائے سے زیادہ دے گا جتنا کہ بالشویک حکومت انہیں دے رہی ہے یا دے سکتی ہے تو وہ ہند کے دوست ہوں گے اور اگر اُس سے کم سرمایہ اُنہیں دیگا تو وہ ہند کے دشمن ہو جائینگے۔ یہ خالصتاً برطانوی مفاد کا معاملہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ برطانیہ سرمائے اور عقل سمجھ میں اتنا مالدار ضرور ہے کہ وہ اس مسئلے کو تسلی بخش انداز میں حل کر سکتا ہے۔'

(صفحہ ۲۲۳)

ہمارے برصغیر کے کچھ لوگ اور رہنما جاپان کی طرف دیکھ رہے ہیں اور کچھ افغانستان کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں اور کچھ روس کو اپنا معین و مددگار سمجھتے ہیں۔ اے قابل رحم ارواح! محنت اور وہ بھی منظم اور سوچ بچار والی محنت ہی آپ کو کامران کر سکتی ہے۔ خالی خولی امیدیں باندھنے سے آپ کو کچھ ہاتھ نہیں آئیگا۔ ہم اپنی مدد کے سوا کسی اور کی مدد پر انحصار نہیں کر سکتے پہلے ہمیں اس اہل ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی مدد آپ کر سکیں اور پھر دنیا بن بلائے ہماری مدد کے لئے دوڑتی چلی آئیگی۔ میں قوی طور پر اس امر کا قائل ہوں کہ اگر ہم اس نیک مقصد کے لئے اپنے آپ کو اہل بنا لیں جو ہمارے پیش نظر ہے تو ہم ضرور اس مقصد کو پا لیں گے۔ یہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور کوئی زمینی طاقت ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مگر جب تک ہم اپنے آپ میں مصمم ارادہ مستقل مزاجی اور ساتھ ہی ساتھ عقلمندانہ قوت ارادی پیدا نہیں کرتے اور اس معاملے پر کہ دنیا کے

احوال کیسے ہیں اور کس رُخ چل رہے ہیں ہماری سیاسی گرفت مضبوط نہیں ہو جاتی اس وقت تک بے فائدہ امیدیں پالنا اور کھوکھلی دھمکیاں دینا محض اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ہمیں اپنے کام پر صحیح سمت میں لگ جانا چاہیئے تب ہی ہم تیقن کے ساتھ اپنی ملی تمناؤں کو جلد یا بدیر حاصل کر سکیں گے۔ عوام کو ترغیب دینے اور ان میں جذبہ پیدا کرنے کے خیال سے اگر ان کے سامنے بلند مقاصد پیش کئے جائیں پھر تو ٹھیک ہے لیکن اگر عوام بآسانی جذباتیت کا شکار ہو جانے والے ہوں یا جنہیں بڑی جلدی بھڑکایا جا سکتا ہو درحالیکہ فوری عمل نہ تو مطلوب ہو اور نہ مقصود تو پھر ایسا کرنا بے حد خطرناک ہے بلکہ مہلک ہے بالخصوص جب بلند مقاصد پیش کرنے والوں کی نیت بھی محض دوسروں کو اکساتے اور انہیں اشتعال پیدا کرنے کی ہو۔'

(صفحہ ۲۲۵)

سلطنتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ حکومتوں کے نظاموں اور عہدوں کو بدلتے ایک دن بھی نہیں لگتا۔ امیر حبیب اللہ خان مرحوم کی مثال ہی لے لیجیئے۔ وہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے سویا تھا مگر پھر اسے جاگنا نصیب نہ ہوا۔ صبح کو وہ اور اس کا نظام حکومت دونوں ریت تلے دب چکے تھے۔ اگر برصغیر ہند کے لوگ یورپیوں کا کام کرنا چھوڑ دیں تو اس کے لئے ایک دن کافی ہے' اسکے لئے ایک مہینہ درکار نہیں۔ اگر برصغیر کے تمام لوگ متحد ہو کر یورپین اقوام کے کام سے انکار کر دیں تو ایسا کرنے میں بس ایک دن لگے گا، سال نہیں لگے گا۔ ویسے اس طرح کرنا ہے بہت مشکل مگر ناممکن نہیں ہے۔'

(صفحہ ۲۲۹)

میں برصغیر کے اپنے بے صبر بھائیوں کو ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ سرخ فوج جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے ہمیں نجات نہیں دلا سکتی اور نہ ہی دلائیگی۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اکیلا افغانستان

ہماری اعانت نہیں کر سکتا روس کے ماسوا کوئی اور ایسی طاقت نہیں ہے جس کا افغانستان کے ساتھ اتحاد ممکن ہو یا جسے کوئی اہمیت دی جا سکتی ہو ۔ ایران اور ترکی بھی کچھ نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جگہ پر پھلتا پھولتا رکھے ۔ ۔ ۔ ۔ '

(صفحہ ۲۳۱)

' پچھلے سال افغانستان کے ساتھ جو جنگ ہوئی تھی وہ انڈو افغان جنگ نہ تھی بلکہ میرے مشاہدے کے مطابق خدوخال ہی وہ اینگلو افغان جنگ تھی برطانیہ کے ہندوستانی حکمران اس امر کے باوجود کہ ہم ان سے بار بار درخواست کرتے رہے ہیں کہ ہمارے اپنے ملک سے تعلق رکھنے والے ہمارے حقوق ہمیں واگذار کئے جائیں ان حقوق کو روکے رکھنے پر مصر رہے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ انہوں نے ہندوستان پر طاقت کے بل پر قبضہ جمایا ہوا ہے ۔'

(صفحہ ۲۳۷)

عوام سے متعلق انتہائی خیالات رکھنے والے لیڈروں اور ان کے نوجوان پیرو کاروں کو کہنے کے لئے میرے پاس کچھ باتیں ہیں ۔ اگر وہ میری معتدل تجاویز پر برا نہ منائیں تو میں عرض کروں :

آپ لوگ بہت عمدہ کام کر رہے ہیں ۔ اللہ کرے آپ کے یہ کام کامیابی سے ہمکنار ہوں ۔ اگر آپ اتنا کچھ کریں جتنا کچھ کہ آپ کہتے ہیں تو صرف آپ کا کیا ہوا آپ کو آپ کی منزل مقصود کی طرف لے جائیگا مگر آپ تو ہوائی قلعے ہی بناتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ حکومت خود اختیاری کی بات کرتے ہیں ۔ خدارا پہلے آپ حکومت کرنے کا ڈھنگ تو سیکھیں اور عوام کو بھی بتائیں کہ حکومت خود اختیاری کیسے کی جاتی ہے ۔ جونہی کہ آپ اور آپ کے عوام اپنے آپ پر حکومت کرنے اور اپنے آپکو ضبط میں رکھنے کا کورس مکمل کر لیں گے آپ کو یقیناً حکومت خود اختیاری مل جائیگی آپ گھر کی حکومت (ہوم رول) کی بات کرتے ہیں ۔ یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن پہلے آپ اپنے گھروں پر حکومت کرنا تو سیکھیں یعنی یہ سیکھیں کہ گھر کو کس

طرح ڈھالنا چاہیئے' اپنے بچوں کو کس طرح پالنا پوسنا چاہیئے۔ اور کس طرح ان کی صحیح تعلیم و تربیت کرنی چاہیے۔ اور خون پسینے کی کمائی کا مصرف کیا ہونا چاہیئے اسی طرح خوراک اور لباس کس قسم کا ہو' مرتے جیتے اور شادی غمی پر ہمارا طرز عمل کیا ہو' سماجی رسومات اور اجتماعات والو داعی تقاریب پر ہمیں کیا کچھ کرنا چاہیے اور خانگی اقتصادیات ہم سے کس روش کا تقاضا کرتی ہے وغیرہ وغیرہ ..... جونہی کہ آپ اپنے گھروں کا انتظام و انصرام مکمل کر لینگے آپ کو ہوم رول مل جائیگا۔ آپ کی چھوٹی چھوٹی گھریلو سلطنتوں میں کرنے کے کاموں کا ایک انبوہ ہے۔ آپ ذرا اپنے ارد گرد نظر تو دوڑائیں اور دیکھیں کہ آپ کی نئی پود کیا کھا رہی ہے' کیا پہن رہی ہے' ان کی رہائش کیسی ہے اور یہ کہ ان کے رہنے کا طور طریقہ کیا ہے۔ آپ اپنے کھانے پینے میں باقاعدگی پیدا کریں۔ آپ اپنی خوراک میں سادگی لائیں۔ اس خوراک میں نشو و نما کے اجزا وافر ہوں اور وہ خوراک سہولت سے ہضم کی جاسکتی ہو۔ آپ ان کے لباس میں اصلاح کریں۔ سیدھے سادے کپڑے اچھے رہتے ہیں۔ کپڑے صاف ستھرے اور آرام دہ ہونے چاہئیں۔ آپ غیر ضروری کھانوں اور ملبوسات کو ختم کریں۔ سالہا سال قبل جب چینی بہت مہنگی ہو گئی تھی تو ایرانیوں نے چائے کا استعمال ترک کر دیا تھا اور اس طرح انہوں نے تفکر اور تردد سے چھٹکارا پالیا تھا۔ اسی طرح جاپان نے یورپین سسٹم اور یورپین طرز تعلیم اور یورپین طور طریقوں کو اپنایا مگر انہوں نے رہنے سہنے کا انداز اپنا ہی جاری رکھا۔ وہ وہی لباس پہنتے رہے جو پہلے پہنا کرتے تھے۔ انہوں نے کرسیوں' میزوں اور گھر کے دیگر فرنیچر سے احتراز کیا۔ آپ اندازہ کریں کہ ایسا کر کے انہوں نے کیا کچھ کمایا اور کیا کچھ بچایا .... اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے کہ آپ ایک یورپین دکھائی دیں تو آپ پہلے اس یورپین کی طرح کردار میں پختگی تو لائیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اپنے ملک اور قوم کا وفادار ہے وہ باحوصلہ

اور مستقل مزاج ہے۔ اسکی قوت ارادی محکم ہے وہ اپنے وقت کی تو ضیع نہیں کرتا بلکہ ہر وقت وہ کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی قوم کی بہبود کی فکر میں رہتا ہے . . . . . وہ اپنی قوم ہی کے لئے زندہ ہے اور قوم ہی کی خاطر مرتا ہے۔ وہ اپنا حق منوانا چاہتا ہے۔ وہ آزاد فضاؤں میں سانس لیتا ہے وہ کسی چیز سے مغلوب نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت پر بے خوفی اور پامردی سے قابو پاتا ہے ' . . . .

اگر آپ اس وقت بے فکر رہیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اپنے آپکو اس کام کے نااہل ثابت کیا جو مہد سے لحد تک آپ کے سامنے ہے۔ متین بنیں، سرگرمی اور سوچ بچار اختیار کریں کیونکہ برصغیر ہندوستان کے مستقبل کی ہر تبدیلی آپ کے موجودہ اندازوں اور فیصلوں پر بہت زیادہ منحصر ہے۔ اس وقت آپ اپنے احساسات، جذبات اور موقع یابی سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور جو عظیم کام آپ کو درپیش ہے اسکی انجام دہی کے لئے اپنے آپکو با ترتیب کریں۔ اپنی زندگیوں میں سادگی لائیں۔ اس سے آپ کے وقت اور سوچ اور پیسے کی بچت ہوگی جسے آپ بعد میں کسی بہتر طریق پر مصرف میں لا سکتے ہیں۔ بیرونی مصنوعات سے اپنے آپکو نجات دلائیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہمارے لوگ کتنی زیادہ کپاس پیدا کرتے ہیں مگر پھر بھی ہمارے ہی لوگ ننگ دھڑنگ ہیں اور چیتھڑوں میں ملبوس ہیں . . . . آپ کے بی اے اور ایم اے پاس انگریزی حکومت کے ہر دفتر کی دہلیز پر بھکاریوں کی طرح جاتے ہیں اور وہاں سے انہیں "ضرورت نہیں ہے" کا جواب ملتا ہے۔ ہمارے جن تعلیم یافتہ افراد کو اگر ستر روپے ماہوار کی نوکری بھی ملتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ مشاہرہ مشکل ہی سے ایک مزدور کے ایسے مشاہرے کے برابر ہے جو کم از کم عمدہ معیار زندگی کے لئے کفایت کرسکے . . . .

اس لئے اے راہبران قوم! آپ اپنی قوم کے بچوں کی تعلیم کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں، حکومت کو مطعون کرنے کا کیا فائدہ؟ اس نے تو آپ کو اس طرح کی تعلیم مہیا کی جس طرح کی وہ خود چاہتی تھی۔ اب آپ اپنے بچوں کو اس قسم کی تعلیم مہیا کریں۔ جس قسم کی آپ چاہتے ہیں

. . . . آپ اپنی مشینری خود بنائیں، اپنی صنعت کو بہتر کریں اور اپنی کپاس اور اون مانچسٹر کو مت جانے دیں۔ آپ کے ملک میں کافی غلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے باہر مت ارسال کرنے دیں بلکہ اسے اپنے لاکھوں بھوکے عوام کیلئے رکھیں

. . . .

مسلمانو اور ہندوؤ! اپنے ملک کے احیائے نو کے عظیم کام میں متحد ہو جاؤ۔ اپنے اختلافات کو بھول جاؤ اور ماضی کی تلخ یادوں کو مت کریدو۔ صدیوں سے یہ دونوں قومیں اکٹھی رہی ہیں . . . . . . ایک دوسرے سے خوف نہ کرو،

(صفحہ ۲۴۰ تا ۲۴۵)

ان مذکورہ بالا ترجمہ شدہ اقتباسات کو پڑھ کر ناظرین پر بخوبی آشکارا ہو گیا ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ہم وطنوں کی آزادی اور حق خود اختیاری کے لئے کتنے زیادہ خواہش مند اور ان کے مستقبل کو درخشاں دیکھنے کے لئے کس قدر متمنی تھے وہ بڑے زیرک، باریک بیں، معاملہ فہم اور مخلص تھے باوجود یہ کہ ان کے اندر آزادی کے لئے جذبات کا ایک سمندر موجزن تھا انہوں نے جوش کے ساتھ ہوش کو ہم آغوش رکھا۔ انہوں نے برصغیر کی مختلف سیاسی تنظیموں کے زعماء کو بھی بادلیل انداز میں یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنی جدوجہد کے دوران ہر قدم اٹھانے سے پیشتر خوب غور و خوض اور تفکر کریں۔ وہ علامہ اقبال کی طرف سے استعمال کئے گئے اس مصرعہ

ع "مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر"

کے مصداق اس بات کے قائل تھے کہ دوسری طاقتوں پر انحصار کرنے کی بجائے ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا خوگر

ہونا چاہیئے۔ انہوں نے برصغیر کے سیاسی اکابرین کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ جب ہمیں خود انحصاری کے اعلیٰ وصف سے عملی محبت ہو جائیگی اور ہم زندگی میں سادگی اختیار کر لیں گے۔ اور ولایتی اشیائے استعمال کو چھوڑ کر اپنے ملک کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کرنے لگیں گے اور محنت وہمت کے عادی بن جائینگے تو دوسری طاقتیں ہمارے غرور ملّی سے متاثر ہو کر از خود ہماری مدد کرنے کے لئے لپکینگی

ڈاکٹر صاحب نے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے اہل ہند کے ساتھ پُر رعونت روش جاری رکھنے' ان کے حقوق کے معاملے میں بے اعتنائی برتنے اور اپنے ہی مفادات پر نظر رکھنے اور انہی کے حصول کے لئے کوشاں رہنے پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ یورپین قوموں کے لئے کام کرنا چھوڑ دیں اور اپنے ملک کی خام اشیاء مانچیسٹر اور یورپ کے دیگر مقامات کو بھجوانا رکوا دیں تو پھر برطانیہ کی یہ استعماری قوت بڑی جلدی گھٹنے ٹیک دینے پہ مجبور ہو جائیگی۔

انہوں نے کہا ہندوستان سے افغانستان کو ہجرت کرنے والے لوگوں کا جذبہ بڑا واجب تکریم ہے۔ مگر انگریز جیسی روباہ صفت اور مدبر قوم ہمارے لوگوں کے ان حربوں سے مات نہیں کھا سکتی' اسے مات دینے کے لئے زیادہ مؤثر تدابیر جو خوب سوچ بچار اور غور وخوض سے تیار کی گئی ہوں کارگر ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے جہاں انگریزی قوم کے اس اعلیٰ تدبر و تفکر کو تسلیم کیا جس کی بنا پہ انہوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو زیرِ نگیں کئے رکھا وہاں انہوں نے ان کی حماقتوں اور نادور اندیشیوں کو بھی بے نقاب کیا۔ انہوں نے جا بجا ان کی ایسی ناعقلمندانہ حکمتِ عملی کی نشاندہی کرتے ہوئے انگریزوں کو احساس دلانے کی سعی کی کہ ان کے ایسے بے وقوفانہ ہتھکنڈوں سے حاکم و محکوم کے درمیان منافرت کی دیوار بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہے جو کہ خود انگریزوں کے مفادات کے لئے بہت نقصان دہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے لوگوں میں سے ایک مخصوص طبقے کی طرف سے انگریزوں کی بے جا خوشامد اور ' YES SIR ' کو قومی خودداری کے منافی قرار دیا اور کہا کہ اس

سے حاکموں کا یہ زعم بڑھ سکتا ہے کہ محکومین بڑے ہی کمزور اور بے حس ہیں

انہوں نے افغانستان اور روس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اکیلا افغانستان ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ روس کے ماسوا کوئی اور ایسی طاقت نہیں جس کا افغانستان کے ساتھ اتحاد ممکن ہو۔ روس اس وقت تک برطانوی ہند پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی طاقت برطانوی طاقت سے دگنی نہ ہو جائے اور افغانستان بھی اس وقت تک برطانوی ہند پر روس کے ساتھ متحدہ حملہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا جب تک اس کے اکثر لوگ تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں اور اس کے خزانے معمور نہ ہو جائیں اور اس کے عساکر جدید سامانِ جنگ سے لیس نہ ہو جائیں۔ انہوں نے قرائن سے افغانستان کے متعلق یہ پیش گوئی کی کہ وہاں بادشاہت بتدریج ختم ہو جائیگی اور اس کی جگہ پر جمہوریت کا دور دورہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب 'اے ریویو' لکھ کر نہ صرف اپنے لوگوں کو حصولِ آزادی کے سلسلے میں اپنی مفید آراء سے مستفید کیا بلکہ انہوں نے انگریزوں کو بھی جو اس وقت برصغیر پاک و ہند پر حکومت کر رہے تھے سمجھایا کہ برصغیر پاک و ہند کے متعلق ان کی پالیسی کے کون کون سے حصے اہل ہند کے نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ اور خود انگریزوں کے مفاد کے منافی ہیں اور بہبود کے لئے انہیں کیا روش اختیار کرنی چاہیئے۔ ۱۹۲۱ء میں جب یہ کتاب چھپی تو ظاہر ہے کہ انگریزوں نے بھی اس کتاب کو پڑھا ہوگا اور ڈاکٹر صاحب کی نشاندہی پر ضرور غور کیا ہوگا جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی پالیسی میں بتدریج ترمیم کی اور یوں ان کی گرفت ہندوستان پر سے آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی گئی۔ گویا برصغیر پاک و ہند کو بہ جو آزادی کی عظیم نعمت نصیب ہوئی تو اس میں جہاں دیگر اکابرین کی ذہنی جدوجہد کا ہاتھ ہے وہاں ڈاکٹر صاحب کی دماغی مساعی کا بھی بہت دخل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی پہلودار شخصیّت

ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور ان کے کارناموں پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ وہ ایک پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ افغانستان اور ہندوستان میں کی گئی گراں مایہ تعلیمی خدمات ان کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ ان دونوں ملکوں میں آزادی کی خاطر جو مساعی انہوں نے کیں وہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو ہے لوگوں کا جسمانی علاج کرنا ان کی حیات کا طبّی پہلو ہے۔ انہوں نے جو تصانیف پیدا کیں وہ ان کی سیرت کا ادبی پہلو ہے۔ خدا وند کریم اور اس کے رسول محتشم ؐ سے والہانہ محبت انکی زیست کا دینی پہلو ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

افغانستان میں پہنچ کر انہوں نے اس کی سنگلاخ سرزمین میں علم کی شمعیں فروزاں کیں وہ قدیم و جدید طرز ہائے تعلیم کے سنگھم یا مابینی پل تھے سرسید احمد خان کی طرح انہوں نے جدید علوم کی ترویج کے لئے بہت کام کیا۔ اِن گوناگوں اور اہم تعلیمی خدمات کی بناء پر انہیں اگر افغانستان کا سرسیّد کہا جائے تو عین بجا ہوگا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ وہ افغانستان میں جدید تعلیم کے بانی ہیں جدید تعلیم کو عام کرنے کی پاداش ہی میں تو انہیں جیل جانا پڑا اسی بنا پر ۲۵ مارچ ۱۹۰۹ء کے پیسہ اخبار میں یہ بات شائع ہوئی کہ ہز مجسٹی سے توقع ہے کہ وہ تحقیق فرمائیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کہیں ملّاؤں کی دشمنی کا شکار تو نہیں ہو گئے۔

اپنے وطن برصغیر ہندوستان میں انہوں نے ۳ برس تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کے طور پر نژاد نو کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں گراں قدر کاوش کی اس عرصے میں انہوں نے ہندوستان کے نونہالوں کو تعلیم و تربیت ہی سے متمتع نہیں کیا بلکہ آزادی کی نیلم پری سے لذّت آشنا کیا۔

ڈاکٹر صاحب جب افغانستان کو مکمل طور پر خیر باد کہہ کر اپنے

وطن مالوف کو آچکے تھے تو وہ تحریک ترکِ موالات کے ایام میں کشمیری بازار لاہور کے اندر قائم ہونے والے آزاد ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے ایک آزاد اور اعزازی ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ایسی نظامت تعلیم کی غرض و غایت یہ تھی کہ برطانوی ہندوستان کے حکومت کے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کرکے ہندوستان کے طلبہ کو اپنی ملکی ضروریات و نظریات کے مطابق زیورِ علم و فن سے آراستہ کیا جائے۔

انہوں نے اپنی کتاب 'ریویو' میں لکھا[1] "ہم برطانوی حکومتِ ہند کو اپنے بچوں کی تعلیم کے بندوبست کے لئے وافر پیسے فراہم کرتے ہیں پھر بھی ہمارے بچوں کو خاطر خواہ اور مناسب تعلیم نہیں مل رہی۔

اے میرے ہموطنو! آپ کو غور کرنا چاہیئے کہ اس نظام تعلیم نے جو انگریزی حکومت نے پیش کر رکھا ہے آپ کو کیا دیا ہے۔ آپ کے بی اے اور ایم اے پاس انگریزی حکومت کے ہر دفتر کی دہلیز پر بھکاریوں کی طرح جاتے ہیں۔ اور وہاں سے انہیں 'ضرورت نہیں ہے' کا جواب ملتا ہے . . . . اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سکولوں اور کالجوں میں چودہ پندرہ سال پڑھائی کی محنت شاقہ کے بعد تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یہ انعام ملتا ہے۔ یہ ہے انجام ایسی تعلیم کا جو انگریز مہیا کر رہا ہے دراصل ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جانب سے ٹھوس تعلیم کے دروازے اہل ہندوستان پر بند ہیں جس کے ذریعے ہندوستانی نوجوان ترقی کی منازل طے کر سکتے ہوں۔ ریاستوں کو خارج کرتے ہوئے باقی برطانوی ہندوستان کے کل مالیے میں سے صرف ایک پیسہ فی کس کے حساب سے تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے اور کل آبادی کا ۹ر۱ فیصد حصہ زیر تعلیم ہے۔ روس میں جو کہ یورپین ممالک کے مقابلے میں نہایت پس ماندہ تھا ۵ر۷ سکّے فی کس تعلیم پر صرف ہوتے تھے۔

اب تو خیر وہاں تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ بڑودا (BARODA) میں وہ تمام بچے جو سکول کو جانے کی عمر تک پہنچے ہوئے ہوں سکول جاتے ہیں جبکہ برطانوی

---

[1] ریویو آف دی پولیٹیکل سچوئیشن ان سنٹرل ایشیا' صفحہ ۲۴۳ تا ۲۴۷۔

ہسند میں ایسے بچے صرف ۵ ء۲۱ فیصد ہیں۔'

ڈاکٹر صاحب جو انگلستان سے ایم آر، سی پی اور ایم آر سی ایس کی اعلیٰ میڈیکل ڈگریاں حاصل کئے ہوئے تھے نہ صرف افغانستان کے شاہی خانوادے کے شاہی طبیب تھے بلکہ چیف میڈیکل آفیسر کابل کے طبی فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب وہ پاک ہسند کو مستقل طور پر آگئے تو اپنے آبائی شہر جلالپور میں تادمِ واپسیں عوام کی طبی خدمت کرتے رہے۔ نادار مریضوں کا تو مفت علاج کرتے تھے۔ البتہ صاحب حیثیت مریضوں سے واجبی سے دام وصول کر لیتے تھے۔ راقم اپنے بچپن میں انہیں روزانہ اس کارِ خیر میں مشغول دیکھتا رہا ہے۔ اِس پہلو پر اور تصنیف و تالیف اور دینداری کے پہلوؤں پر کتابِ ہذا کے دیگر صفحات میں مبسوط ذکر کر دیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب تحریک آزادی کے لئے مختص ہے اس لئے ہمیں اب ذیل میں ان کی زندگی کے سیاسی پہلو پر کچھ مزید روشنی ڈالنی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب نے ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کی بہبود کے لئے جو جدوجہد کی وہ سید جمال الدین اور محمد عبدہ کی پان اسلامک تحریک سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ملک کے مسلمان کل ملّتِ اسلامیہ کے الگ الگ رکن کی حیثیت سے اپنا ایک جداگانہ مستقل وجود رکھتے ہیں[1]۔ ڈاکٹر صاحب عالمِ اسلام کے اتحاد اور ہم آہنگی کے بڑے آرزومند تھے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں انہیں مسلمانوں کی نااتفاقی کا علم ہوتا تو انہیں بہت دکھ ہوتا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دشمن قوتیں جو مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے آپس میں متحد ہو چکی ہیں، مسلمانوں کی بے اتفاقی اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر انہیں سخت گزند پہنچا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

---

[1] "کابل میں سات سال" از مولانا عبید اللہ سندھی

Your bitter foes, the foes of unity,
Their poisoned shafts lodged subtly in your flanks,
Your name from earth they threaten to efface,
Rouse fallen brethren, off your slumber shake.

ترجمہ :-

تمہارے بدترین دشمن وہ ہیں جو تمہارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں نیز وہ اپنے زہریلے تیر تمہارے پہلوؤں کو شدید گھائل کرنے کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔

وہ روئے زمین سے تمہارا نام نیست و نابود کر دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ اے زوال آشنا بھائیو! اپنے خوابِ غفلت کو اپنے سے دور کرو۔

خواہ کوئی بھی سیاسی تنظیم ہو وہ دوسری قومی اور بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی تنظیموں اور تحریکوں سے عموماً کسی نہ کسی حد تک اثر قبول کیا کرتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے کابل میں جو تنظیم "مجلسِ جان نثاران" بنائی تھی، اس نے انڈین نیشنل کانگرس سے متاثر ہو کر غیر ملکی ساخت کے لباس کی بجائے ملکی لباس کو اپنایا۔ اُن دنوں اگر آل انڈیا مسلم لیگ پنپ چکی ہوتی تو اغلب ہے کہ مجلسِ جان نثاران اور مسلم لیگ دونوں تنظیمیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتیں کیونکہ ان دونوں سیاسی جماعتوں کا ایک بڑا مقصد اسلامی نظریۂ حیات کی آبیاری کرنا بھی تھا۔

ہر دیال و مولوی برکت علی :- ان دنوں ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے نئی نئی سیاسی تحریکیں وجود میں آ رہی تھیں۔ جس طرح ڈاکٹر عبدالغنی اور حاجی ترنگ زئی اور شیخ اقبال شیدائی نے مل کر کابل میں آنڈیا انڈی پینڈینس

لیگ کی داغ بیل رکھی تھی اسی طرح ایک نوجوان ہردیال نے مولوی برکت اللہ کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل پارٹی تشکیل دی۔

جنگ عظیم شروع ہونے پر جس قدر آزادی خواہ ہندوستانی یورپ میں موجود تھے وہ سب برلن میں جمع ہوئے۔ انہوں نے جرمنی دفترِ خارجہ کے تحت انڈین نیشنل پارٹی قائم کی۔ ہردیال دہلی کا باشندہ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ یہ آکسفورڈ میں تعلیم مکمل کرنے کے لئے ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر عبدالغنی کی طرح سرکاری وظیفہ پاکر انگلستان گیا۔) آخری قسط وظیفے کی اس نے یہ کہہ کر واپس کردی کہ وہ ہندوستان کے تعلیمی نظام سے مطمئن نہیں۔ ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آیا۔

۱۹۰۸ء میں اس نے لاہور میں برطانوی خبروں کا بائیکاٹ کرنے کی مہم چلائی۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کابل میں تھے، وہ ابھی حاسدوں اور سازشیوں کے افتراء کا شکار ہوکر جیل نہیں گئے تھے۔ اس کے بعد ہردیال ہندوستان چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے غدر پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں یہ نوجوان جرمنی کے دفتر خارجہ کے ماتحت کام کرنے کے لئے برلن چلا گیا اور وہاں اس نے انڈین نیشنل پارٹی قائم کی۔ اس پارٹی میں ہردیال اور مولوی برکت اللہ وغیرہ شامل تھے۔

مولوی برکت اللہ امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا یہ برلن کے راستے کابل پہنچا۔ یہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا۔ انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کرچکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام "اسلامک فرٹرنیٹی" تھا۔ حکومتِ برطانیہ نے اس اخبار کو بند کرکے اسے پروفیسری سے معزول کردیا۔ وہ جاپان چھوڑ امریکہ میں اپنی غدر پارٹی سے جاملا۔

انڈین نیشنل پارٹی کے زیر اہتمام راجہ مہندر پرتاپ اور ان کے رفقاء کو جن میں مولوی برکت اللہ بھی شامل تھا جلد ہی ترک و جرمن افسروں کے

ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا . . . . . . عہ

علامہ مشرقی و مولانا مودودی سے ربط

قبلہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۱ء میں جب اپنے وطنِ عزیز کو مستقلاً چلے گئے تو وہ خلوت گزینی کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنے شہر کے لوگوں کی طبّی خدمت کرتے رہے بلکہ انہوں نے مختلف سیاسی و دینی تنظیموں سے رسم و راہ رکھی۔ برصغیر کی سیاسی صورتحال کی روشنی میں انہوں نے سیاسی رہنماؤں کو اپنی کتاب ل ریویو آف دی پولیٹیکل سچویشن اِن سینٹرل ایشیا، لکھ کر کچھ کار آمد مشورے دیے۔ اس کے علاوہ کبھی علی برادران اور کبھی ابو الکلام آزاد کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ان کے پوتے رانا ظہور الحق کا پیر عباس کے حوالے سے کہنا ہے کہ ابو الکلام آزاد جب اسلامیہ اسکول گجرات آکر ٹھہرتے تو ڈاکٹر صاحب بھی انہیں ملنے جاتے۔ علاوہ بریں انہوں نے علامہ عنایت اللہ المشرقی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ خصوصیت سے رابطہ رکھا۔ وہ علامہ مشرقی کی عسکری تنظیم 'خاکسار' سے بڑے متاثر تھے۔ راقم کو اپنے بچپن کی یہ بات یاد ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اور مولانا صاحب (مولانا نجف علی خان) کو ان کی پیر سالی کے باوجود خاکساروں کی وردی پہن کر اور شانے پر بیلچہ رکھ کر جلالپور کے اڈہ تانگہ کو سالار کی حیثیت سے جاتے اور پریڈ میں شامل ہوتے دیکھتا تھا۔ راقم السطور کو یہ بھی یاد ہے کہ اس نے اپنے بچپن میں گھر کی لائبریری میں ترجمان القرآن کے چند شمارے دیکھے تھے۔ اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے نیز اس امر سے کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا

'TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM'

کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ کیا بھی ہویدا ہے کہ یہ دونوں بھائی سید مودودی کے افکار سے بھی متاثر تھے اور خواہشمند تھے کہ ان دینی اور سیاسی تحریکوں میں

ل 'کابل میں سات سال' صفحہ ۴۱

سے کسی نہ کسی کے ذریعے برصغیر کی آزادی کا سورج طلوع ہو

ہر عظیم شخص اپنی زندگی کے خاص دور میں کارکردگی اور شہرت کے بام عروج پر پہنچتا ہے ڈاکٹر صاحب بھی ۱۸۹۰ء سے لیکر ۱۹۰۹ء تک اور پھر ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۱ء اپنی ترقی اور نیک نامی کی بلندیوں پر رہے بعض شخصیتیں اپنے اس منزلِ مقصود کو جو انہوں نے اپنے لئے متعین کر رکھا ہوتا ہے پا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور بعض پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں۔ اس کا تعلق قضاو قدر سے ہے۔ بس اپنے اپنے حصّے کی کارگذاری کو نہایت احسن طریقے سے نبھانا ہی کامیابی ہے خواہ بظاہر تکلیفوں، قیدوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بعض دفعہ بظاہر ناکامی کی تہ میں کامیابی چھپی ہوتی ہے۔ ایک طوفانی دریا کی لہریں ساحل دریا کے ساتھ بار بار ٹکرا کر بظاہر ناکام لوٹتی ہیں مگر اے دیکھنے والے تو اگر غور سے دیکھے تو یہ بار بار ٹکرانے والی موجیں انجام کار اپنا کام کر چکی ہوتی ہیں اور ساحل کے نچلے حصّے کو کافی اندر سے کرید کرید کر مٹی اور سنگ ریزوں کو اپنے ساتھ بہا لے جانے میں کامیاب ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہی حال آزادی کے دریا کا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے سالاروں نے خواہ وہ علی برادران[7] (مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی) ہوں یا عاصی برادران[7] (ڈاکٹر عبدالغنی و مولانا نجف علی عاصی) ہوں اپنے اپنے وقت پر تا تواں جدوجہد کی گو انکی مساعی اُس وقت بار آور نظر نہ آئیں لیکن حریّت کے ان مختلف علمبرداروں کی کوشش در پردہ اپنا کام کر گئی تھیں اور بآخر علامہ اقبال[7]، مولانا ظفر علی[7] اور قائد اعظم محمد علی جناح[7] جیسی شخصیتوں کے زوردار جھٹکے سے لیلائے مقصود ہاتھ آ گئی۔

ڈاکٹر محمد عبدالغنی آزادی کی عمارت کی بنیادی سلوں میں سے ایک اہم سل تھے مگر بڑی حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قوم نے ان کی یاد کو طاقِ نسیان پر رکھ دیا۔ تعجّب ہے کہ افغانستان کی سرزمین میں

پہنچ کر حصول آزادی کے سلسلے میں خدمت انجام دینے والی دیگر شخصیتوں مثلاً مولانا عبید اللہ سندھی اور شیخ اقبال شیدائی کو تو یاد رکھا گیا ہے مگر ڈاکٹر عبد الغنی جیسی ہستیوں کو جنہوں نے تعلیم، جمہوریت اور آزادی کے لئے بڑی گراں بہا تگ و دو کی بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی قربانیاں

جب ڈاکٹر صاحب اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلے میں انگلستان میں مقیم تھے تو پہلے قربانی انہوں نے یہ کی کہ دار العلوم میں خلافت ترکیہ کی حمایت میں انہوں نے حکومت برطانیہ کے خلاف براہین قاطع سے لبریز کئی بار شعلہ نوائی کی جس کی پاداش میں ان کا سٹیٹ سکالر شپ بند ہو گیا۔

جب وہ اپنی اعلےٰ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے اور برطانیہ کی ہندوستانی حکومت نے انہیں SECRETRAY TO THE VICEROY کا عہدہ جلیلہ اور پیش بہا جاگیر اس لئے پیش کی تاکہ وہ مسلم ریاستوں افغانستان یا ترکی کی خدمت کے لئے نہ جائیں بلکہ اس کے زیر دست رہ کر غلام ہندوستان میں ملازمت کریں مگر ڈاکٹر صاحب نے ایثار سے کام لیتے ہوئے ہندوستانی حکومت کی پیش کش کو رد کر دیا۔ کہہ دینا تو آسان ہے مگر ایسی قربانیاں عملاً کر دکھانا نہایت مشکل امر ہے۔ اگر اس فرد میں قوتِ ایمانی محکم ہو اور توفیق ربی اس کے شاملِ حال ہو تب ہی وہ ایسی کڑی آزمائشوں میں پورا اتر سکتا ہے یہ بھی تو ایک قربانی ہے کہ ان کے بڑے بھائی (مولانا نجف علی خان صاحب جو ہائی کورٹ لاہور میں ایک محفوظ اور عالی اسامی پر بحیثیت ہیڈ ٹرانسلیٹر متعین تھے ڈاکٹر صاحب نے انہیں محض اس لئے اس ملازمت سے اکھیڑا اور کابل منگوا لیا کہ انگریز کی نوکری باعث عار ہے اور قومی حمیت کے منافی ہے یہ بھی کم ایثار

نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے افغان حکومت کے ہاتھوں اپنی جامہ تلاشی کے باوجود پھر امیر افغانستان حبیب اللہ خان کی طرف سے عذر خواہی پر دوبارہ افغانستان کی خدمت کے لئے روانہ ہونے کا ارادہ کر لیا اور اسلامیہ کالج لاہور کی پرنسپلی کے اچھے بھلے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔

قربانی کا ایک اور بہت بڑا کام یہ کیا کہ افغانستان میں دوبارہ پہنچکر ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائیوں نے نئی سرگرمی سے معارف کی ترویج وتوسیع کے لئے خدمت شروع کر دی مگر اس فرمانروا حبیب اللہ خان جس نے معذرت کے خطوط لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ بلا بھیجا تھا اور جنہوں نے دوبارہ جاکر معیار اور مقدار کے اعتبار سے معارف کی بہت زیادہ خدمت کی تھی چند سازشیوں کے بہکاوے میں آکر انہیں ساڑھے دس سال کے طویل عرصے کی اذیت دہ قید میں مبتلا رکھا۔ معارف کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی گوناگوں خدمات کے اعتراف میں عبدالحی حبیبی کا بیان ہے کہ "اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ بغیر دلائل ایک انسان کو اور خصوصاً ایک مسلمان کو (یعنی ڈاکٹر عبدالغنی کو) جس نے سالہا سال ہمارے معارف اور ہماری مطبوعات کے سلسلے میں ہماری گران قدر خدمت کی ہو متہم کر دیا جائے"[۱]

ایک اور غیر معمولی قربانی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس مسلمان افغانستان کی خدمت کے لئے برصغیر سے ہجرت کرنے کو پسند کر لیا۔ اسی ملک میں مخالفوں کے ہاتھوں ان کا چودہ سالہ معصوم لخت جگر عبدالجبار ان کی ۱۱ سالہ نظربندی کے دوران شہید ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس ناحق قتل کے پیچھے انہی ناہنجاروں (منہاج الدین، عبدالحق اور محمد حسین مستوفی الممالک) کا ہی ہاتھ ہو جن کی ریشہ دوانیوں سے ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھی گیارہ سال اذیت ناک قید بھگتتے رہے۔

---

[۱] جنبش مشروطیت در افغانستان، صفحہ ۶۷

جب یہ تینوں بھائی گرفتار کر لئے گئے تو ان کی جائیدادوں کو جو کابل میں تھیں ضبط کر لیا گیا۔ انہیں یہ ایک اور بھاری قربانی دینی پڑی۔ ان کے اہل و عیال کو نان و نفقہ اور دوسری ضرورتوں کے سلسلے میں ایسے دردناک حالات میں سے گزرنا پڑا جسے سن کر کلیجہ دہل جاتا ہے۔ مولانا نجف علی خان علامی اپنے ایک حزنیے میں ارگ شاہی سے امیر حبیب اللہ خان کو مخاطب کرکے جس اندوہناک انداز میں اپنے اہل و عیال کی معاشی بدحالی کا تذکرہ کرتے ہیں اسکی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

ترا دانستہ بودم عینِ عدل اے شاہِ دین پرور
ازیں جورے کہ برا اہل و عیالم رفت حیراںم
اثاث البیت غربت را مقفل حملتہً کردند
نمے دانم بریں دردم چہ خواہد بود درمانم
نماندہ ہیچ ملبوسِ من اندر اختیارِ من
کفایت در نمو ز چوں کند رخت زمستانم
درخت آساکہ از بادِ خزاں برگش فرد ریزد
نہ بے برگی فغانہا مے کشد اولادِ عریانم
چنانم بے قرار و مضطرب بر بسترِ غمہا
کہ گوئی بافتند ایں بستر از خار مغیلانم

ترجمہ:۔

سرکاری آدمیوں نے مسافری کے ہمارے تمام سامان کو تالے لگا دئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے اس درد اور پریشانی کا کیا علاج ہوگا۔ میرے گھر کے کپڑوں میں سے کچھ بھی تو میرے اختیار میں نہیں رہنے دیا گیا۔ میرا سردیوں کا لباس کھلا کر میوں میں کیسے کام دے سکتا ہے۔ اس درخت کی طرح جس کے پتوں کا لباس پت جھڑ کے موسم میں ہوا کے جھونکوں سے جھڑ

جکا ہو، میری اولاد بھی لباس نہ ہونے کی وجہ سے آہ و فغاں کر رہی ہے
میں غم و اندوہ کے بستر پر ابسبابے قرار اور پریشاں حال ہوں گویا میرے بستر
کو کسی نے کانٹوں کی رسیوں سے بُن دیا ہے۔

بہ جائیداد یں بحق سرکار ضبط ہو جانے کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر
صاحب کے فرزند عبدالحق صاحب اور دیگر افراد خانہ جب کابل سے پشاور پہنچے
تو ان کی حالت زبون تھی۔ ان کے کپڑے بوسیدہ اور بہت میلے تھے اور.....

..... آگے قلم اجازت نہیں دیتا اور مناسب بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان
کی ایسی نجی باتوں کا تفصیل سے اور باریکیوں کے ساتھ تذکرہ کیا جائے۔

پیسہ اخبار کے مدیر صاحب نے ڈاکٹر صاحب اور ان کے
بھائیوں کی بلند کرداری اور نیک سیرتی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ
حاسدوں کے حسد و بغض کا شکار ہوئے اور بے جرم دھر لیے گئے اور ان کی
گرفتاری پر امیر حبیب اللہ خان سے ان کی رہائی کے لئے اپیل کی گئی۔
مدیر موصوف نے لکھا کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی قناعت شعار اور
نیکوکار تھے اور انہوں نے اپنے قیام کابل میں اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ باوجود
ملازمت و مرتبے کے طامع نہ ہونے کی بنا پر پنجاب میں کسی کوئی وسیع جائیداد
پیدا نہیں کی۔

ان کی گیارہ سالہ طویل قید سے ایک اور نقصان یہ ہوا یا انہیں ایک
اور قربانی یہ دینی پڑی کہ ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت جاری نہ رہ سکی۔ عبدالجبار
شہید نے چھ سات جماعتیں کابل میں پڑھی تھیں[1] ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کے دوسرے
بیٹے عبدالحق صاحب اور مولانا نجف علی خان صاحب کے اکلوتے بیٹے عبدالمجید صاحب
کی تعلیم و تربیت منقطع ہو گئی۔ قارئین خود اندازہ کریں کہ اولاد کی تعلیم و تربیت
کے زمانے میں جب باپ اور چچا ایک لمبے عرصے کے لئے نظر بند ہو جائیں

---

[1] بیان مولانا ظہورالحق پسر عبدالحق صاحب مرحوم،
[2] بیان حافظ عبدالمجید صاحب مرحوم

اور پیچھے اولاد کے لئے کفالت کا کوئی بندوبست نہ رہے تو کیا اولاد کی تعلیم و تربیت
بھلا جاری رہ سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جب ڈاکٹر صاحب
اور مولانا صاحب نظربندی سے رہا ہوئے تو انہوں نے اپنی اولاد کی گھر پہ
ہی کچھ تعلیم و تربیت کی۔ کسی اگلے صفحے پر مولانا صاحب کی اُن تحریروں کا ایک نمونہ
پیش کیا گیا ہے جو انہوں نے بندی خانے سے اپنی رہائی کے بعد اپنے
فرزند عبدالمجید صاحب کو پڑھانے کے لئے لکھیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ایک بھائی حکیم غلام حیدر مرحوم جو افغانستان
نہیں گئے تھے اور اس طرح باقی بھائیوں کی طرح قید نہیں ہوئے تھے وطن میں
ہی رہے۔ انہوں نے یہ قربانی کی کہ آبائی قابل کاشت زمین جو علاقہ بجوات
میں تھی بیچ بیچ کر جیسے نہ صرف اپنے گرفتار بھائیوں کے خرچ کے لئے کابل بھیجتے رہے
بلکہ وطن میں ان کی اولادوں کا خرچ چلاتے رہے۔

ان گرفتار شدہ بھائیوں کے کرداروں کی عظمت اور خدادوستی کا مظہر
یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے حوصلے بلند رکھے اور پہاڑ کے برابر اپنی اس
مصیبت کو مشیت ایزدی جان کر یہ گیارہ لمبے سال یادِ الٰہی میں گزارے۔
انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور قرآن مجید کا ترجمہ لکھا۔ مولانا نجف علی
خان نے ارگ شاہی میں حسیات لکھیں اور بادشاہ وقت کو، اپنے فرزند کو
اور دوسرے مسلمان نوجوانوں کو منظوم پند و نصائح لکھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے معاہدہ راولپنڈی کے دوران بھی قربانی
و ایثار سے کام لیا۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے افغانستان کی سابقہ حکومت کے ہاتھوں
متعدد قسم کے کاری زخم کھانے کی تلخیوں کو پس پشت ڈال کر نہایت صمیم قلب
سے [illegible] سادات کی بالادستی کے لئے سر ہملٹن گرانٹ کے زیر قیادت آئے
ہوئے انگریزی وفد کے ساتھ ٹیبل ٹاک کرتے ہوئے کامیابی حاصل کی۔ دوئم
معاہدہ راولپنڈی کی گفت و شنید شروع ہونے سے پیشتر ڈاکٹر صاحب نے سر ہملٹن

کی جانب سے کمشنری کے عالی عہدے اور زر خطیر کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا جو انہیں اس لئے پیش کی گئی تھی تاکہ وہ افغان مفادات کے لئے فعال کام نہ کریں۔

اگر ڈاکٹر صاحب اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد برطانیہ کی ہندی حکومت کی پیش کردہ جاگیروں اور سیکرٹری برائے وائسرائے کے بلند عہدے کو قبول کر لیتے اور اس عہدے پر ملازمت کرتے رہتے یا پھر معاہدہ راولپنڈی ------ والی محولہ بالا پیش کش کو مان لیتے تو ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کی اولاد تنگ دستی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے نوابوں، جاگیرداروں اور سر کا خطاب رکھنے والوں کی سی شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتی اور اعلیٰ مراتب کی حامل ہوتی۔ مگر چونکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے برادران دینی گھرانے کے تربیت یافتہ تھے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ان کے شامل حال رہنے کی بنا پر وہ بلند سیرت و کردار کے مالک تھے اس لئے وہ برطانوی استعماری طاقت کے آگے بکے نہیں اور اس طرح وہ اپنی عاقبت سنوار گئے۔

راقم الحروف سمجھتا ہے کہ اگر دنیا میں ڈاکٹر صاحب اور مولانا صاحب کا نام اجاگر نہیں ہے تو اس میں نام و نمود سے ان کی اپنی بے پرواہی کا بھی بڑا دخل ہے۔ شہرت یابی کے سلسلے میں ان کی اس بے حرصی و لا پرواہی کے پیچھے ان کی خدا جوئی اور اسلام دوستی کام آتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب کے لواحقین

ڈاکٹر صاحب کے لواحقین میں سے چند کا ذکر یہ ہے:

(۱) مولانا نجف علی عاصیؔ:

مولانا نجف علی خان عاصی کی زندگی اور ان کے کارناموں کے وسیع مطالعہ کے لئے عبدالجلیل نجفی کے تنقیدی مقالے "احوال و آثار مولانا نجف علی خان" کو پڑھا جا سکتا ہے۔ بہر حال ان کے مختصر حالات یہاں پر قلم بند کئے جا رہے ہیں البتہ کوشش کی جائے گی کہ ان باتوں کی تکرار بیان نہ ہو اور اگر ہو تو بہت کم باتوں کی تکرار ہو، جو کتاب ہذا کے باقی حصوں میں منتشر حالت میں مندرج ہیں:

قبلہ مولانا صاحب ڈاکٹر صاحب سے ۴ سال بڑے تھے،
اُن کا سنِ ولادت ۱۸۶۰ء ہے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی، اے اعلٰے درجے پر پاس کر لینے کے بعد ہائیکورٹ لاہور میں ہیڈ ٹرانسلیٹر کے طور پر متعین ہوئے مگر وہ اپنی اس ملازمت سے مطمئن نہ تھے۔ اس کا سبب یہ تھا انہیں انگریزی حکومت کے ماتحت ملازمت کرنے سے نفرت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو امیر عبدالرحمان خان والیٔ افغانستان کے میر منشی (سکریٹری) کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے جب لگ بھگ دو برس ہو گئے تو ایک روز انہوں نے امیر موصوف کے سامنے مولانا صاحب کا کسی ضمن میں تذکرہ کیا۔ امیر مذکور کو کسی ایسی شخصیت کی تلاش تھی جو خود عالم فاضل ہو اور خاص طور پر انگریزی میں طب اور دیگر علوم پر لکھی ہوئی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کی اچھی خاصی قابلیت رکھتا ہو تاکہ افغان لوگ ان علوم کی گرانمایہ کتب کو اپنی زبان میں پڑھ اور سمجھ سکیں۔ امیر عبدالرحمان خان نے ڈاکٹر صاحب کو اصرار سے کہا کہ اپنے بھائی مولانا صاحب کو برصغیر سے بلا بھیجیں۔ اس طرح مولانا ۱۸۹۲ء

ہیں ہیڈ ٹرانسلیٹری کے عہدے سے سبکدوش ہوکر کابل پہنچے گئے۔ مولانا خود اس امر کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ "پہلے ایک انگریز آرنلڈ نامی بحیثیت مترجم مقرر تھا مگر وہ چونکہ فارسی زبان کی موشگافیوں کو نہیں جانتا تھا اس لئے وہ تسلی بخش ترجمان ثابت نہ ہوسکا۔" [1]

کچھ عرصہ بعد امیر حبیب اللہ خان نے مولانا کو دارالترجمہ والتالیف و التصنیف کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ مولانا نے متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مثلاً امیر افغانستان نادر شاہ کے بھائی سردار ہاشم خان کے ایماء پر انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی کی معروف "مسدس حالی" کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا۔ انہوں نے نادر شاہ کی خواہش پر مولانا شبلی نعمانی کی معرکتہ الآرا کتابوں سیرۃ النبی اور الفاروق کا بھی ترجمہ کیا۔ نادر شاہ کے ایک اور بھائی سردار شاہ محمود کو ان دونوں بھائیوں مولانا صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت تھی۔ اس نے مولانا کو مخاطب کرکے اردو میں ایک طویل خط لکھا جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور جسے "احوال و آثار مولانا نجف علی خان" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ [2]

مولانا اعلیٰ پایہ کے مترجم ہونے کے علاوہ فارسی کے ایک بلند مرتبت شاعر تھے۔ ڈاکٹر سید اختر مسعود رضوی صدر شعبہ فارسی پشاور یونیورسٹی نے بھی ان کی باعظمت شاعری کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "عاصی کی نظموں اور نثر پاروں کا بیشتر حصہ ابھی تک منصہ شہود پر نہیں آیا اس لئے فی الحال ان کے مجموعی علمی و ادبی سرمائے کا جائزہ لیکر برصغیر کی بیسویں صدی کے علماء اور فارسی گو شعراء میں ان کا مقام متعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہر حال ان کی تخلیقات کے جو نمونے اور مثالیں اس کتاب میں دی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فنی اور علمی کاوشیں مشرقی شاعری کی درخشاں ترین خصوصیات اور اسلامی تہذیب و تمدن کی صالح ترین روایات کی آئینہ دار ہیں۔" [3]

---

[1] احوال و آثار مولانا نجف علی خان۔ صفحہ ۱۶

[2] احوال و آثار، صفحہ ۷

مولانا نجف علی خان عاصی

مولانا عاصی کی باقی تصنیفات یہ ہیں :۔

تحفۂ امانیہ (مطبوعہ) ۔ موعظۂ نادرہ (مطبوعہ) نیز یک عہد قربان (مطبوعہ)
رسالۂ پیغمبر اسلام (غیر مطبوعہ) ۔ بیاضِ عاصی (غیر مطبوعہ) ۔ مکتوباتِ
عاصی (غیر مطبوعہ)

عاصی برادران (مولانا نجف علی عاصی و ڈاکٹر عبدالغنی) اور علی برادران (مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر) میں کئی باتوں میں مماثلت ہے۔ جس طرح چھوٹے بھائی مولانا محمد علی جوہر کو سیاسی اعتبار سے اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی پر سیاسی اعتبار سے قدرے فوقیت حاصل ہے گو موخر الذکر کا اپنا ایک اعلےٰ مقام متعین ہے اس طرح ڈاکٹر عبدالغنی کو اپنے برادر اکبر مولانا نجف علی پر سیاسی اور تعلیمی خدمات کے لحاظ سے کچھ برتری حاصل ہے اگرچہ موخرالذکر کو بجائے خود ایک معتبر مقام حاصل ہے۔

عاصی برادران میں سے چھوٹے یعنی ڈاکٹر عبدالغنی انگریزی بولنے اور لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اس حقیقت کی تصدیق دیگر شخصیتوں کے علاوہ عبدالحی حبیبی کے استاد اور رشتہ دار مولوی عبدالواسع نے یوں کی ہے کہ ڈاکٹر عبدالغنی لندن سے حاصل کئے گئے علوم میں اور انگریزی زبان میں بہت زیادہ ماہر تھے [۱]
اسی طرح علی برادران میں سے چھوٹے یعنی مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ اخبار میں انگریزی کا ایسا بلند معیار قائم کیا کہ اس وقت کے وائسرائے ہند اور ان کی اہلیہ اس اخبار کو روزانہ باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے بے تاب رہتے۔

مولانا نجف علی عاصی فضلاء کے اُس گروہ سے نظریاتی وابستگی رکھتے تھے جس کے بہترین نمائندے حالیؔ، اقبالؔ اور اکبر الٰہ آبادی تھیں مسلمانوں کی ترقی و ترفیع کی شدید آرزو نے عاصی کو مضطرب رکھا۔ حالیؔ، اقبالؔ اور اکبرؔ نے برطانوی ہند کی حکومت کی طاغوتیت کی لعنت کا قریب سے

[۱] جنبشِ مشروطیت، صفحہ ۶۱

مشاہدہ کیا جبکہ عاصی نے افغانستان کی حکومت کی آمریت کے مکروہ کردار کا نزدیک سے جائزہ لے رکھا تھا۔ عاصی اس تجزیے میں سے عملاً گذرے تھے جس میں سے حالی، اقبال اور اکبر کو گذرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا بہ دیگر الفاظ عاصی کو امیر حبیب اللہ خان کے حکم سے قید و بند میں ڈال دیا گیا جہاں وہ گیارہ طویل سالوں تک ذہنی اذیت جھیلتے رہے۔

مولانا نجف علی خان عاصی شاعری میں مزاجاً اور طبعاً دبستان سعدی سے منسلک شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ سعدی کا ایک شعر ہے:

ع

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و در ماندگی

ترجمہ: حقیقی دوست اسے کہنا چاہیے جو اپنے دوست کی پریشاں حالی اور بے کسی میں اس کا ہاتھ پکڑے۔

اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوئے جناب عاصی کا یہ شعر ہے:

ع

دوستاں را وقتِ سختی آزما
تا شود تصدیقِ دعوائے وفا

ترجمہ:۔ اے مخاطب! دوستوں کا امتحان اپنی مصیبت کے ایام میں لے تاکہ ان کی وفا کے دعوؤں کی پرکھ ہو سکے۔

عاصی اور مسعود سعد سلمان کی حبسیات میں بھی کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

ھ

چناں بیقرار و مضطرب بر بستر غمہا
کہ کوئی یافتند ایں بستر از خارِ مغیلانم (عاصی)

ترجمہ: میں غموں کے بستر پر بہت بے چین اور بے قرار پڑا ہوا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرے بستر کو مغیلاں کی خاردار رسیوں سے بن دیا ہو۔

ے

روز و شب یک زماں قرارم نیست
راست گوئی بر آتش و خارم

ترجمہ: مجھے دن اور رات میں کسی وقت ذرا بھی قرار حاصل نہیں ہو رہا۔ اے مخاطب تو نے سچ کہا کہ میں آگ اور کانٹوں پر لیٹا ہوا ہوں۔

مولانا نجف علی خان عاصی اس دار فنا سے دار البقاء کو ۱۹۵۰ء میں سدھارے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہِ راجعون ط

(۲) حکیم غلام حیدر

حکیم غلام حیدر صاحب عمر میں ڈاکٹر صاحب سے ۴ برس چھوٹے اور مولوی محمد چراغ صاحب سے ۴ برس بڑے تھے۔ یہ اپنے بھائیوں کو ملنے کے لئے متعدد بار افغانستان گئے مگر بھائیوں کی طرح وہ زیادہ عرصے کے لئے وہاں رہے نہیں اور نہ ہی وہاں مقید ہوئے وہ زیادہ تر برصغیر ہند میں اپنے والدین کے پاس ہی رہے اور نہ صرف والدین کی خدمت کرتے رہے بلکہ ڈاکٹر صاحب اور دوسرے بھائیوں کی قید کے طویل تکلیف دہ عرصے میں بجوات والی زمین بیچ بیچ کر انہیں ارگ شاہی کابل میں خرچ بھیجتے رہے اور نیز اپنے اہل و عیال اور کابل میں موجود ان کے اہل و عیال کے اخراجات چلاتے رہے۔ چونکہ وہ اپنے بھائیوں کے زمانہ حبس میں کھلے بندوں ان کی مالی اعانت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں چوری چھپے پیسے بھیجنے کی کئی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ حکیم صاحب نے قرآن مجید کی جلد کے اندر پیسے محفوظ کر کے قرآن مجید بمعہ ایک رقعہ ارگ کو

بھیج دیا اور اس رقعے میں بھائیوں کو یہ سمجھانے کے لئے کہ اس میں نقدی ہے لکھ دیا کہ اس کے مغز کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے۔"

ان کے والدِ گرامی یعنی مولوی عبدالصمد جب فوت ہوئے تو ڈاکٹر صاحب اور برادران ابھی قید نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ اپنی ترقی اور خوشحالی کے دور میں سے گذر رہے تھے۔ ایک دفعہ امیر عبدالرحمان خان کی خواہش اور دعوت پہ مولوی عبدالصمد صاحب کابل بھی گئے تھے اور امیر مذکور نے ان کی بڑی پذیرائی کی تھی اور اس نے کہا تھا "آپ کے ماتھے سے عیاں ہوتا ہے کہ آپ بڑے صاحب بخت ہیں" اور جب مولوی صاحب برصغیر کو لوٹنے لگے تو امیر نے انہیں دیگر اعزاز و اکرام کے علاوہ عمدہ نسل کے کئی گھوڑے عطا کئے تھے مولوی صاحب نے وطن پہنچ کر ان گھوڑوں کو اچھے داموں بیچا تھا اور اس رقم سے بجوات والی زمین خریدی تھی۔ [1]

اس ذکر سے مدعا یہ ہے کہ مولوی عبدالصمد اپنے بیٹوں کے عروج و شادمانی کے دور میں فوت ہوئے لیکن ڈاکٹر صاحب کی والدہ ماجدہ نے اپنے بیٹوں کے آلام حبس کے ایّام میں رحلت کی اور وہ رحلت سے پیشتر کئی برس تک اپنے سے بہت دور دوسرے ملک میں مقید اپنے تین بیٹوں کے فراق میں غم کھاتی رہیں۔ شدت ملال سے بہت حد تک اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں اور وہ عالم اضطراب میں اپنے گھر کے بیرونی دروازے کی دہلیز میں جا بیٹھتیں اور ہر راہ گذرنے والے سے پوچھتیں "کیا تم نے میرا نحیف علی نہیں دیکھا؟ کیا کہیں میرا عبدالغنی تمہاری نظر سے نہیں گذرا؟ آیا تمہیں میرا محمد چراغ ملا تھا؟ ان کے پاس موجود بیٹا (یعنی حکیم غلام حیدر صاحب) ان کو دلاسے دیتے رہتے کہ وہ تینوں عنقریب رہا ہو کر آپ کے پاس آجائیں گے وہ عالم خستگی و پیرسالی میں انتظار کی گھڑیاں گن

---

[1] بیان دخترِ حکیم غلام حیدر صاحب و والدۂ محترمہ راقم السطور

گن کر راہیٔ ملک عدم ہو گئیں۔

حکیم صاحب مرحوم و مغفور جوانی میں بڑے شاہ زور تھے اور اس عہدِ جوانی میں قوت کے کئی کام ان سے منسوب ہیں۔ انہیں یونانی حکمت کا اچھا خاصا تجربہ تھا اور اللہ تعالےٰ نے ان کے ہاتھ میں بہت شفا ڈال دی تھی۔ شفا کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ نہایت پرہیزگار اور شب خیز تھے۔ راتوں کو اللہ تعالےٰ کے حضور گڑ گڑاتے اور دعائیں مانگتے۔ ان کی بعض دعائیں بہت جلد مستجاب ہوئیں۔ دوئم وہ نہایت قناعت شعار اور بے حرص تھے۔ جب وہ کسی مریض کو دوا دیتے تو بہت معمولی دام وصول کرتے۔ اس مردِ درویش کا ایک بیٹا مولوی عبدالکبیر دینی علوم کا ایک جید عالم بن ہی رہا تھا کہ عین شباب میں اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ؏۱

(۳) مولوی محمد چراغ

یہ ڈاکٹر صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ریاضی و تاریخ میں بی اے پاس کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے افغانستان کی تعلیم عمومی کی ترویج و اشاعت کے کام میں معاونت کے لئے انہیں بھی برصغیر سے بلا لیا تھا۔ مولوی صاحب کئی دیگر تعلیمی معاملات کی ذمہ داری نبھانے کے علاوہ مکتبِ حبیبیہ کابل کے صدر معلم اور انسپکٹر آف سکولز رہے۔ مجلسِ جان نثاران کی سرگرمیوں کے سلسلے میں انہیں بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ گیارہ سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ رہائی ملنے پر وطن کو لوٹے تو یہاں بھی درس و تدریس کا کارِ خیر انجام دیتے رہے۔

کسی اور مقام پر بھی بتایا جا چکا ہے کہ دینداری میں یہ چاروں بھائی ایک، دوسرے سے بڑھ کر تھے، چنانچہ مولوی محمد چراغ صاحب بھی صوم

؏۱ حوالہ راقم السطور و والدہ ماجدہ

وصلوٰۃ اور دوسری اسلامی اقدار اور اصولوں کے بہت پابند تھے۔

لفظ مولوی سے راقم کا خیال عبدالحئ حبیبی[1] کے اس لکھے کی طرف چلا گیا کہ "ہندوستان میں لفظ مولوی ان اشخاص کے لیے مستعمل ہے جو علوم دینیہ یا اسلامی ادب میں ماہر ہوں خواہ وہ ادب عربی میں ہو یا فارسی میں، چونکہ یہ اشخاص ہندوستان سے جدید علوم حاصل کر کے افغانستان آئے لہذا یہ لفظ احترام کی علامت کے طور پر ان اشخاص کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ ان اصحاب نے انگریزی زبان میں ریاضی اور طبیعات وغیرہ کو پڑھا تھا اور پھر بعد میں انہوں نے افغانستان کے مختلف تعلیمی اداروں میں ریاضی، طبیعات اور جغرافیہ وغیرہ کے علوم پڑھائے بھی۔

مولوی محمد چراغ صاحب نے شعر و سخن میں بھی تھوڑی بہت طبع آزمائی کی۔ ان کی ایک نظم ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ موصوف کی دو بیٹیوں[2] نے بتایا ہم ابھی کسی پرائمری کلاس میں پڑھتی تھیں کہ ہماری استانی نے ایک دن ہمیں ہوم ورک یہ دیا کہ ایک نظم زبانی یاد کر کے آؤ۔ ہم گھر پر وہ نظم یاد کر رہی تھیں کہ والد گرامی نے جو وضو کر رہے تھے ہمیں وہ نظم یاد کرتے ہوئے سنا۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ اس نظم کو رہنے دو میں تمہیں ایک اور نظم لکھاتا ہوں وہ یاد کر کے جا سنانا۔ چنانچہ انہوں نے چند ہی منٹوں میں ذیل کی نظم فی البدیہہ تیار کر کے انہیں لکھا دی:۔

جنجوعی قوم کی ہوں اونچا میرا گھرانا

دادا میرے معزز عالم تھے میرے نانا

مرحوم دونوں بھائی معروف تھے وطن میں

تھا امتیاز ان کو اخلاق و علم و فن میں

حلقوں میں علم کے ہے بس احترام ان کا

افغان کی سیاست میں نیر نام ان کا

---

[1] جنبش مشروطیت در افغانستان، صفحہ ۶۳

[2] خانم و صفیہ

میرو وزیرزادے سب ان کے تھیں تلامذ
شاہوں کے وہ اتالیق عمّال کے اساتید

شوریٰ کے تھے وہ اعضا اور واضح قوانین
پنڈی کی کانفرنس صلحیہ کے اراکین

نذورقلم نے ان کے افغان کو حر بنایا
برطانیہ کا غلبہ برسوں کا تھا ہٹایا

بے علم سب کا پیشہ اور حلم سب کا شیوہ
میرا ہی ہے شجرہ جس کا میں ایک میوہ

(۴) عبدالجبار شہید:-

عبدالجبّار ڈاکٹر صاحب کا بیٹا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک بیٹا عبدالحق ایک بیوی میں سے اور عبدالجبار دوسری بیوی میں سے تھا۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک بیوی جب فوت ہوئی تب وہ دوسری بیوی لائے۔ مولوی عبدالحق صاحب تو بڑھاپے کی عمر کو پہنچکر فوت ہوئے مگر عبدالجبار عین عنفوانِ شباب میں شہید کر دیا گیا۔ یہ شہادت کابل میں اس زمانے میں وقوع پذیر ہوئی جب ڈاکٹر صاحب قید کے گیارہ برس گذار رہے تھے معلوم نہیں کہ اس معصوم کو ان شقی القلب افراد میں سے کس نے قتل کرایا جو ڈاکٹر صاحب کے درپے آزار تھے اور ان کی گرفتاری کا سبب بنے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب ارگ شاہی میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے اس بیٹے کی شہادت کی جانکاہ خبر ملی تو انہیں بے حد صدمہ ہوا اور انہوں نے اس کے خون آلود کپڑے منگوا بھیجے اور ان کپڑوں کو دیکھ کر خوب روئے۔ بالآخر انہوں نے صبر کرتے ہوئے کہا جس ظالم نے یہ سفاکانہ کام کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قہر سے بچ نہیں سکتا،[1]

عبدالجبّار بڑا ذہین بچہ تھا جب وہ شہید ہوا اسکی عمر تقریباً

---

[1] بیان والدہ راقم الحروف

۱۹۳۴ء تک تھی اور وہ کابل میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔[1]

قارئین عبدالجبار کی شبیہہ اس کتاب کی اس تصویر میں دیکھ سکتے ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ مولوی محمد چراغ دو بھانجے مولوی عبدالرحمان اور مرتضےٰ اور وہ بوڑھی انگریز خاتون جسے ڈاکٹر صاحب ماں بنا کر لندن سے ہمراہ لائے تھے سبھی موجود ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے دو بیٹے ہوئے عبدالسلام وظہورالحق۔ ڈاکٹر صاحب کی دو بہنیں تھیں ایک بہن کے دو بیٹے مولوی عبدالرحمان اور راجہ محمد عبداللہ تھے اور دوسری بہن کے دو بیٹے مصطفےٰ اور مرتضےٰ تھے راجہ محمد عبداللہ صاحب کا کچھ تذکرہ کتاب ہذا کے ابتدائی حصے میں ضمناً کیا جا چکا ہے۔ مصطفےٰ اور مرتضےٰ کی اولاد جلالپور جٹاں کے نزدیک موضع بھاگووال میں مکین ہے۔

(۵) حافظ عبدالمجید نجفی

حافظ عبدالمجید صاحب ابن مولانا نجف علی خان کی پیدائش ۱۰ اپریل ۱۸۹۹ء کو ہوئی۔ ان کی والدہ ایک قریشی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ سولہ برس کے تھے کہ والدہ وفات پا گئیں۔ ان دنوں ان کے والد ماجد اور ان کے چچا وغیرہ محبوس تھے۔ جب ان کے پدر بزرگوار گرفتار ہوئے تو عبدالمجید صاحب کی عمر ۱۲ سال تھی۔ اس گرفتاری کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ عبدالمجید صاحب ایک دن امیر حبیب اللہ خان فرمانروائے افغانستان کی کار کے سامنے آ کھڑے ہو گئے۔ امیر نے کار کو روک کر پوچھا "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے التجا کی کہ "میرے باپ اور چچاؤں کو رہا کر دیا جائے"۔ امیر نے یہ کہہ کر کہ "اچھا رہا کر دیں گے" وہاں سے روانگی اختیار کی مگر اس نے بعد میں اپنے وعدے پر عمل نہ کیا۔[2]

---

[1] بیانِ والدہ راقم الحروف۔ والدِ گرامی حافظ عبدالمجید نجفی عبدالجبار شہید سے عمر میں ایک سال بڑے تھے۔ [2] والدہ ماجدہ محترمہ راقم الحروف

مولانا نجف علی خان صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی طویل قید سے جہاں اور کئی غیر معمولی نقصانات ہوئے وہاں یہ بہت بڑا نقصان بھی ہوا کہ نہ حافظ عبدالمجید صاحب اور نہ مولوی عبدالحق صاحب کی تعلیم جاری رہ سکی۔ بعد میں جب مولوی نجف علی خان رہا ہوئے تو انہوں نے گھر پر اپنے بیٹے عبدالمجید صاحب کو لکھایا پڑھایا۔ اس درس و تدریس کے نمونے کے طور پر مولانا نجف علی خان صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مندرجہ ذیل تحریریں ملاحظہ ہوں:۔

between us and the moon.

Persevere

When you've work to do, boys,
Do it with a will:
They who reach the top, boys,
First must climb the hill
Standing at the foot, boys,
Gazing at the sky,
How can you get up, boys,
If you never try?
Though you stumble oft, boys,
Never be downcast,
Try, and try again, boys,—
You'll succeed at last.

The lazy Man.

A lawyer had been very busy all the morning writing out some papers. "Peon, Peon," he called out at two o'clock "come here." Here I am, Sahib," replied Ahmad the peon, making a salaam. "Take this box to the office," said his master; "go at once, and lose no time. The clerk is waiting."

"I am off, Sahib," said the peon, as he took the box, made another very low salaam, and walked off.

The office was two miles away from the house, and it was a very hot day. The peon walked very fast, so long as he was within sight of the house. Then he walked much more slowly, and now and then he stopped, as he met a friend on the road, to talk to him.

At last he came to some shady bushes by the side of the road. "I think I must take a little rest here," he said to himself. "This is a very heavy box, and I am tired."

So down he sat under the shade of the bushes. "It is very nice and cool here", he thought, "why should I not have a short sleep and then go on? Ten

ڈاکٹر صاحب تو معاہدہ راولپنڈی ۱۹۱۹ء کے کچھ ہی عرصہ بعد افغانستان کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن آگئے مگر مولانا نجف علی خان صاحب مزید کچھ عرصے تک کابل ہی رہے۔ امیر امان اللہ خان نے کابل کے مضافات میں انہیں حق استادی کے ایک حصے کے طور پر ایک قطعۂ زمین عطا کیا تھا۔ مولانا وطن کو آچکنے کے بعد بھی اپنے فرزند حافظ عبدالمجید کی ملاقات کے لئے وقتاً فوقتاً کابل آنے جانے رہے کیونکہ ان کے فرزند موصوف ایک طویل عرصے تک کابل میں ہی مکین رہے۔ عبدالحئی حبیبی نے اپنی کتاب "جنبش مشروطیت در افغانستان" میں لکھا ہے کہ "اس وقت مولانا نجف علی صاحب کے واحد فرزند عبدالمجید نجفی ہی کابل میں مکین ہیں"[1] حافظ عبدالمجید صاحب فرماں روا ظاہر شاہ کے عہد کے آخر تک کابل میں ہی رہے اگرچہ یہ بھی اس دوران وطن کو آتے جاتے رہے۔ اس کے بعد یہ بھی ۱۹۶۰ء میں مستقلاً وطن کو آگئے۔

راقم الحروف نے ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے روزنامہ مشرق کو حافظ عبدالمجید صاحب نجفی کے متعلق ایک مضمون دیا تھا اسے من وعن یہاں دہرائے دیتا ہوں:۔

ضلع گجرات کے حافظ عبدالمجید نجفی جلالپوری مولانا نجف علی خان عاصیؔ مرحوم سابق اتالیق امیر امان اللہ خان والئ افغانستان کے فرزند ہیں۔ اس وقت انکی عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ جس طرح علامہ شبلی نعمانی کی ناتمام سیرت النبیؐ کو ان کے شاگرد رشید علامہ سلیمان ندوی نے مکمل کیا اسی طرح مولانا نجف علی خان کے ادھورے منظوم ترجمہ فارسی مسدس حالی کو ان کے مذکور فرزند ارجمند نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

---

[1] جنبش مشروطیت در افغانستان، صفحہ ۶۵

وہاں استاد اور شاگرد کی کوششیں کارفرما تھیں جبکہ یہاں باپ اور بیٹے کی مساعی بارآور ہوئی ہیں۔ نہ صرف باپ نے بلکہ بیٹے نے یہ ترجمہ کرنے کا حق ادا کیا ہے۔ اِس عمدگی کا اعتراف ذیل کے نامور تبصرہ نگاروں نے اُن الفاظ میں کیا ہے۔

رضا ہمدانی ڈائریکٹر مرکزی اردو بورڈ (پشاور شاخ) لکھتے ہیں "۔۔۔۔ مدو جزرِ اسلام جو مسدس حالی کے نام سے زیادہ پہچانی جاتی ہے ایک عہد آفریں اصلاحی نظم ہے جس کی اہمیت و عظمت میں آج تک کمی واقع نہیں ہوئی اور جو امتِ مسلمہ کے لئے آج بھی چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کی افادیت کے پیشِ نظر برصغیر کی چند ایک زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔ ان میں مولانا نحیف علی خان عاصی مرحوم کا ترجمہ بھی ہے جو فارسی زبان میں ہے عاصی مرحوم کا یہ ترجمہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ان مسلم ممالک کے عوام کے لئے سبق آموز ہے جو اردو زبان نہیں جانتے۔

جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے یہ سادہ، سلیس اور بے تکلف ہے۔

اسلوبِ بیاں کے پیشِ نظر نہ تو لفظی ترجمے کا اس میں نقص ہے اور نہ ہی اصل مطلب و مفہوم کو حذف کیا گیا ہے بلکہ ترجمے میں اصل روح کو قائم رہنے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حالی نے کہا تھا۔

ے

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوا پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

اس بند کا عاصی نے یوں ترجمہ کیا ہے :۔

کہ تا غیرتِ حق سرِ کار آمد
ز ابرِ کرم فیض بسیار آمد
وجودے ز بطحے پدیدار آمد
کہ عالم ازو پُر ز انوار آمد
شد از پہلوئے آمنہ آں ہویدا
دعائے خلیل و نویدِ مسیحا

. . . .

عاصی صاحب نے تلمیحات کی تشریح کے لئے جو وضاحتیں کی ہیں وہ نہ صرف ایک عام قاری بلکہ طلبہ کے لئے خصوصاً ممد و معاون ہیں۔ عاصی صاحب کے ترجمے کی افادیت کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعے کو درسی کتب میں شامل ہونا چاہیئے تھا۔ کاش یہ سکول یا کالج کی سطح تک فارسی نصاب کا ایک حصہ ہوتا۔ مجھے علم نہیں کہ آج تک اس ترجمے کو طلبہ سے کیوں دور رکھا گیا تاہم دیر آید درست آید۔ اب اگر اسے نصاب میں شامل کر لیا جائے تو طلبہ کی کما حقہ ذہنی تربیت ہو سکتی ہے۔"

پروفیسر اشرف بخاری نے لکھا ". . . اس فارسی ترجمے کا متن میں نے مطالعہ کیا۔ ترجمہ بڑی کاوش سے سلیس اور شستہ فارسی میں کیا گیا ہے۔ .

. . . . . . "

ڈاکٹر کے بی نسیم صدر شعبۂ فارسی پشاور یونیورسٹی لکھتے ہیں " . . . . . . اس منظوم ترجمے کی زبان میں قابلِ تعریف سہل پن اور اور سلاست ہے۔ اس میں کمال کی بات یہ ہے کہ ترجمہ نہ لفظی ہے اور نہ

اصل مدعا و مطلب مسخ ہوا ہے، ترجمے کے اظہار بیان میں وہی شیرینی و دلآویزی ہے جو اصل مسدس کا خاصہ ہے .... ترجمہ اتنا سہل ہے کہ زیادہ فارسی نہ جاننے والا اردو داں بھی مطلب سمجھ جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اندرون ملک و بیرون ملک (ایران و افغانستان) کے مسلمانوں کے لئے اس ترجمے کا پڑھنا بڑا سود مند رہے گا۔

بقول حافظ عبدالمجید نجفی انہوں نے نہ صرف اس پورے ترجمے کے آخری چوتھائی حصے کو انجام دیا بلکہ سارے ترجمے پر نظر ثانی کی کیونکہ عاصی صاحب نے پہلے ..... تین حصوں کو اس زمانے میں تخلیق کیا جبکہ ان کے اعصاب مضمحل ہو رہے تھے اور نسیان کا عارضہ بڑھ رہا تھا۔

اگرچہ ترجمے کا اصل سال ۱۹۴۱ء ہے مگر یہ کتابی صورت میں ۱۹۷۸ء میں چھپ سکا۔ اسکی اشاعت سے پیشتر اس ترجمے کے مسودے کو پشاور یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کے پروفیسر مرتضیٰ اختر (ابن ضیا جعفری مرحوم و مغفور) کے حوالے کیا گیا اور انہیں زحمت دی گئی کہ وہ اس تمام منظوم ترجمے پر نظر ثانی کریں۔ انہوں نے بڑی باریک نگہی سے اس پر نظر ثانی کی اور اس میں متعدد مفید ترمیمیں کیں۔

حافظ عبدالمجید صاحب نے اس منظوم ترجمے کی تکمیل کے علاوہ فارسی اور اردو میں بہت سی نظمیں لکھیں، فارسی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اردو کی بہت کم، یہی حال مولانا نجف علی خان عاصی کے کلام کا ہے۔ فارسی میں باپ بیٹے کے زیادہ کلام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے مگر انہوں نے کافی عرصہ کابل میں گذارا۔

اب حافظ عبدالمجید کی ایک اردو نظم بطور نمونہ درج کی جاتی ہے:

دعائے احسن

یارب صفائے قلب کی دولت نصیب کر
محشر میں انبیاء کی رفاقت نصیب کر

عشق رسولِ پاک سے کر مجھ کو سرخرو
آل نبیؐ کی دل کو محبت نصیب کر

پروردگار مجھ کو بچا حرص و آز سے
جو کچھ دیا ہے اُس پر قناعت نصیب کر
جو کر سکے تمیز حلال و حرام میں
اے کردگار ایسی بصیرت نصیب کر

حافظ عبدالمجید صاحب نے ۲۰ جنوری ۱۹۸۱ء کو لاہور میں رحلت کی۔ راقم نے ان کی رحلت کے وقت ایک اخبار کو "آہ حافظ عبدالمجید نجفی" کے زیرِ عنوان ایک مضمون برائے اشاعت دیا تھا جسے یہاں بھی نقل کیا جا رہا ہے:۔

"ایک وہ وقت تھا جب ۱۰ اپریل ۱۸۹۹ء کے روز حافظ عبدالمجید نجفی نے ایک نو زائیدہ طفل کی شکل میں مولانا نجف علی خان عاصی جلالپوری کے گھر میں پہلی بار آنکھ کھولی اور پھر وہ وقت آیا جب ۲۰ جنوری ۱۹۸۱ء کی شب کو انہوں نے ۸۲ سال کی ایک لمبی مسافتِ عمر طے کر کے اپنی جان اپنے جاں سپار کے سپرد کرتے ہوئے آنکھ بند کر لی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مرحوم کے لڑکپن کے اوائل ہی میں انکے والد گرامی کے نظر بند ہو جانے اور کابل میں بحقِ سرکار جائیداد ضبط ہو جانے کے سبب سے آرام و آسودگی سے شروع ہونے والی ان کی زندگی مصائب اور پریشانیوں کی زندگی میں بدل گئی، چنانچہ خود انہوں نے اپنے اس لڑکپن کے زمانے میں اپنی تبدیلیٔ حالت کا جو نقشہ پنجابی اشعار میں کھینچا ہے اس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:۔

ع

اپنے دل غم دبرہ وچوں کڈھ بخار پرانا
لکھ پروانہ باپ سجن نوں پھر وا ایسر دبوانا

حافظ عبدالمجید نجفی مرحوم

کابل دے وِچ باپ سیری ماں پیاری ہوئی
سفراں وِچ مصیبت جھلاں ملے نہ کِتّھے ٹُوئی

اِک دن میں سانعمت اندر شہزادہ سدوانداا
ہراک صاحب عزت مینوں کچھڑ وِچ کھڈانداا

دوست سارے دشمن ہوئے اپنے ہوئے بیگانے
کوئی کول کھلون نہ دیندا ڈسیا رنگ زمانے

بس مجیدا نہ کر جھیڑے دنیا کوڑ پسارا
کون رہیا تے کون رہے گا ہر اک چلّن ہارا

مرحوم حافظ عبدالمجید نجفی اپنے والدِ بزرگوار اور والدہ ماجدہ سے حاصل کی گئی تعلیم و تربیت کے زیرِ اثر بہت سی خوبیاں رکھتے تھے مثلاً وہ حد درجے کے وعدہ وفا تھے، غیر معمولی فیاض تھے، بڑے مہمان نواز تھے، حتی الامکان معیاری طعام و نوش اور معیاری اشیاء کا استعمال کرتے، وہ شب بیداری کر کے بیمار کی تیمارداری کرتے لیکن اگر خود بیمار پڑ جاتے تو رات کو کسی کو بے آرام و بے خواب نہ ہونے دیتے. خندہ خو اور ملنسار تھے المختصر بحیثیت انسان بڑے عالی ظرف تھے اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے...

(نوٹ : اُن کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بڑی توجہ اور چھان بین سے اپنے واجب الاحترام باپ اور قابلِ تکریم چچا (قبلہ ڈاکٹر صاحب) کے نوشتہ بکھرے پُرزوں کو یکجا کیا اور ترتیب دیکر پاک نویس کیا اور یوں اُن تحریروں کو ضایع ہونے سے بچا لیا۔

باب دہم

متفرقات

ڈاکٹر صاحب کی فصاحت و بلاغت

عبدالحئی حبیبی کے ایک معلم اور تعلق دار عبدالواسع کا کہنا ہے کہ میں نے پہلے کبھی ڈاکٹر عبدالغنی کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جب مجھے قید خانۂ ارگ شاہی کابل میں اسے اول بار دیکھنے اور پہچاننے کا اتفاق ہوا تو میں نے اسے انگریزی مشرب اپنائے ہوئے ایک شخص پایا اسے انگریزی زبان پر اور ان علوم پر جو اس نے لندن میں سیکھے تھے۔ اچھا عبور حاصل تھا مگر اسے مشرقی ادب اور مشرقی تہذیب و ثقافت کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں تھی اور وہ فارسی میں رک رک کر اور ٹوٹے پھوٹے انداز میں بات کر سکتا تھا جبکہ وہ انگریزی زبان میں بڑی روانی سے گفتگو کر سکتا تھا بلکہ وہ اس خارجی زبان میں اپنے آبائی وطن ہندوستان کی زبان اردو سے بھی زیادہ سہولت کے ساتھ بات کر سکتا تھا۔ [۱]

مجھ راقم السطور کو عبدالواسع سے اس امر میں اختلاف ہے۔ میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا اور پروفیسر محمد حسین جالندھری بی اے علیگ وغیرہ شخصیتوں کے بیانات سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی اذکار و اعمال کے حامل تھے۔ دونوں بھائیوں یعنی ڈاکٹر عبدالغنی اور مولانا نجف علی بڑے فاضل اور پرہیزگار تھے۔ [۲] ڈاکٹر صاحب کی علمی و اخلاقی لیاقت مسلم تھی۔ انہیں لندن کی اسلامی محفلوں میں بحیثیت ایک فصیح و بلیغ مقرر بڑی شہرت حاصل تھی۔ [۳]

ڈاکٹر صاحب کے فارسی زبان پر عبور رکھنے کے لئے یہاں پر نہ صرف ان کے منظوم تماشا چے' فریاد مبنائے مسافر' کے کچھ اشعار درج کئے جا رہے ہیں بلکہ ان کی

---

[۱] جنبش مشروطیت، صفحہ ۶۱

[۲] بحوالہ تحریری بیان از میاں محمود علی قصوری

[۳] انقلاب افغانستان، صفحہ ۱۱۰ از مولوی محمد حسین جالندھری

لکھی ہوئی تاریخ افغانستان جسے انہوں نے انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا کے اقتباسات بھی رقم کئے جا رہے ہیں،

فریادِ مبتلائے مسافر

کنارِ آبِ کابل سے پریدم — بہ بستان سرا بستان رسیدم
زمانے چند با ئید بم درے — ز ہر نغمہ سرائیدیم در دے
زینر نگِ نوائے ما غریباں — بسے مسرور شد دارائے بستاں
گلستاں اندر آمد با مدارے — تبسّم کرد و فرمود ایں خطابے
کہ اے میناۓ خوش خواں وخوش الحاں — صدائت تازہ مے ساز د دل وجاں
نوائت غنچۂ دل مے کشائد — زدل صبر و زجاں ہوشم رباید

الخ

ترجمہ:-

"میں مینا یعنی عبدالغنی اڑتا اڑتا دریائے کابل کے کنارے پہنچا۔ وہاں پر واقع امیر عبدالرحمان خان کے شاہی محل جس کا نام بستان سرا تھا کے باغ میں داخل ہوا۔

میں اور میرے بھائی کچھ عرصے تک اس باغ میں ٹھہرے اور ہم نے وہاں ہر قسم کے عمدہ گیت گائے۔

ہم مسافروں کی خوبصورت آواز کے سحر سے باغ کا مالک یعنی امیر عبدالرحمان خان بہت خوش ہوا۔

ایک دن وہ اس باغ کے اندر آیا اور مسکراتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

اے اچھی آواز اور دلکش لے والے مینا یعنی عبدالغنی تمہارے گیت اتنے اعلیٰ ہیں کہ ان کو سنکر دل اور جان میں تر و تازگی آجاتی ہے۔

تمہارے رسیلے نغموں سے دل کی کلی کھل جاتی ہے، اور دل اور جان سے صبر اور ہوش جاتے رہتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی انگریزی نثر کے طلبے اور پیچ در پیچ فقرات

کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

To put high ideals before the public is right enough, as far as it is instructive and inspiring, but for emotional and easily inflamable people, when immediate action is neither meant nor desirable, it is extremely dangerous, nay, fatal, if it is done in an exciting and incendiary spirit. The slow inculcation of such ideals, with the education of self-control, and inducing natural development in the minds, and bringing mental depth and energy to maturity so as to properly judge the suitability of opportunity for action -- action determined and organised -- would be the real statesmen's method. *

* 'A Review of the Political Situation in Central Asia' P 225.

ترجمہ :۔

عوام کے سامنے بلند مقاصد رکھنا بہت اچھی بات ہے بشرطیکہ ان کے ذریعے عوام کو ہدایت کرنا اور ان کے اندر جذبہ ابھارنا پیشِ نظر ہو، مگر آسانی سے جذبات میں آجانے اور جلدی بھڑک اٹھنے والے عوام کے لئے درحالیکہ فوری عمل نہ تو مدعا ہو اور نہ اسکی خواہش ہو ایسا کرنا بہت خطرناک ہے بلکہ بہت مہلک ہے درآں صورت جب کہ پرجوش آور نیت اور آتش زن ارادے سے کیا گیا ہو۔ ایسے مقاصد کو آہستہ آہستہ عوام کے دل نشین کرنا ایک حقیقی سیاست دان کا طریق کار ہے۔ جبکہ وہ ساتھ ساتھ عوام کو خود انضباطی کی تعلیم دے۔ اور وہ ان کے قلوب میں ترقی کرنے کی تحریص پیدا کرے اور وہ عوام میں سوچ کی گہرائی سے کام کرنے اور اپنی توانائی کے مصرف سے پختہ کاری برتنے کا شوق پیدا کرے۔ اور وہ ان میں کسی کام کے لئے عملی اقدام کرنے سے پیشتر مناسب موقع کا صحیح اندازہ کر سکنے کی قابلیت اجاگر کرے اور پھر وہ اقدام نہ صرف عزم بالجزم سے کیا جائے بلکہ منظم طریقے سے کیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اور عبارت میں شخصی تصویر کشی کا حسن ملاحظہ ہو:

Amir Habibullah Khan was a thorough gentleman in manners, and a very shrewd observer. He possessed extra-ordinary intelligence and marvellous memory. His interest in photography amounted to foundness, and he had made quite a hobby of it. He sedulously studied and practised photography, and became quite experienced in it. He was also fond of fine arts, and was a good critic of painting and music.......... He was a great observer of formalities in the court, and spent a lot of time in arranging its details. He was particularly fastidious in dress, and in the harmony of his surroundings. He had a habit of stammering, but he got over it, a good deal, by constant practice of speaking. He was a good speaker, and latterly posed as an orator. He had a strong healthy physique, a little inclined to obesity, which worried him as it detracted from the symmetry of his body...........

Amir Habibullah's harem was full, almost to choking and his strictness in formalities even extended there...Latterly he became very fond of harem life and spent much time there. He took special pleasure in arranging the dresses and duties of his numerous wives. They were made to dress in European fashion, and he liked a moonlight ride in the midst of a levy of them. His harem indulgence at last told on his nerves, and he became very irritable. In the end he could not bear a brain-work; the slightest exertion to think fatigued him.*

* A Brief Political History of Afghanistan's Page 226

ترجمہ :-

"امیر حبیب اللہ خان آداب و اطوار میں ایک عجیب شخص تھا۔ وہ بڑی ذہانت سے معاملات کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ وہ غیر معمولی ہونہار تھا اور تعجب خیز یادداشت کا مالک تھا۔ فوٹوگرافی میں اسکی دلچسپی شوق کی حد تک تھی۔ اور اس نے اسے بطور شغل اپنا رکھا تھا۔ وہ فوٹوگرافی کے فن کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا تھا اور اسکی مشق کرتا تھا۔ اُس نے بالآخر اس میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ وہ فنونِ لطیفہ کا بھی شائق تھا اور نقش و نگاری و موسیقی کا ایک اچھا نقاد تھا۔

. . . . . . وہ لباس کے معاملے میں خوش ذوق تھا اور لسے اپنے گرد و نواح میں ہم آہنگی دیکھنے کے سلسلے میں خصوصیت سے فکر رہتی۔ اسے لکنت کی عادت تھی مگر بعد میں اُس نے اس نقص پر قابو پا لیا۔ وہ ایک عمدہ بولنے والا تھا اور کچھ مدت بیت جانے پر اسے اپنے متعلق بلیغ ہونے کا گمان ہونے لگا۔ وہ ایک تنومند جسم رکھتا تھا مگر پھر اس کا جسم مزید فربہ ہونا شروع ہو گیا جس پر اسے اندیشہ لاحق ہوا کیونکہ اس سے اُسکے جسم کی خوبصورتی کچھ حد تک ختم ہونے لگی۔

امیر حبیب اللہ خان کا حرم بیگمات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور تکلفات برتنے کا اس کا ذوق وہاں بھی پہنچا ہوا تھا۔ بعد میں وہ حرم کی زندگی کا بہت ہی شائق ہو گیا اور وہ اپنا زیادہ وقت حرم میں گذارنے لگا۔ وہ اپنی لاتعداد بیگمات کے ملبوسات اور ان کی ذمہ داریاں مرتب کرنے میں خصوصی طور پر لطف اندوز ہوتا تھا۔ انہیں وہ یورپی طرز کا لباس پہناتا اور ان کے جھرمٹ میں چاند رات کی سیر کو جانا بہت پسند کرتا۔ حرم میں اس کے بے حد انہماک نے انجام کار اس کے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا اور وہ زود رنج سا بن گیا۔ زندگی کے آخری حصے میں اسکی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ تھوڑا سا دماغی کام کر سکنے کے اہل بھی نہ رہا اور معمولی ذہنی سوچ کرنے پر وہ بہت زیادہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگتا۔"

امیر حبیب اللہ خان کی یہ نایاب اور واحد تصویر ہے جو اس کی بیگمات
کے جھرمٹ میں ایسے زمانے میں کھینچی گئی جب افغانستان میں پردے
کی سخت پابندی تھی۔ یہ تصویر غالباً ۱۹۰۵ء کی ہے (بحوالہ 'ریفارم اینڈ
ریبلیئن ان افغانستان'، صفحہ ۳۷)

ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں قارئین ان کے یہ جملے پڑھیں :۔

The war with Afghanistans last year was Anglo-Afghan in character, as I have observed before, and not Indo Afghan. As the British rulers of India, in spite of our repeated requests for our rights in our own country, are insisting upon with-holding them from us, simply because they happen to hold India by force — as it has been repeatedly declared by responsible British statesmen that India was taken with the sword and must be kept with the sword -- and that as it has to be bled the lancet must be inserted wherever it is most congested, and as the pratice of our rules has closely followed that percept, thereby assuring us in the most matter of fact way that we were quite wrong in believing that the interest of the rulers and the people was one and the same, we are obliged now to look to our interest i.e. the interest of India-Propria.

ترجمہ :۔

"پچھلے سال انگریزوں اور افغانوں کے مابین جو جنگ ہوئی تھی وہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میرے مشاہدے کے مطابق خدوخال میں اینگلو افغان جنگ تھی نہ کہ انڈو افغان جنگ۔ چونکہ ہندوستان کے برطانوی حکمران ہمارے اپنے ہی ملک میں ہمیں حق خود اختیاری دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں حالانکہ ہم نے اس سلسلے میں بار بار درخواست کی ہے، اور وہ ہمارے برصغیر ہندوستان کو اپنے ہی قبضے میں رکھنے کے لئے مُصر ہیں اور یہ محض اس لئے کہ انہوں نے اس ملک کو طاقت کے بل پر فتح کیا تھا جیسا کہ ہندوستان کے ذمہ دار برطانوی سیاست دان بھی وقتاً فوقتاً یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کو بزور طاقت زیر کیا تھا اور ضرور بزورِ طاقت ہی اس پر قبضہ جمائے رکھیں گے اور یہ کہ اس کے لوگوں کا خون بہانے کے لئے انہیں اپنے نشتر کو اس مقام پر گاڑنا ہوگا جہاں یہ خون زیادہ گاڑھا ہو چکا ہے وہ یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ ان کے

اپنے اصولوں کے تتبّع نے انہیں یہ ادراک عطا کیا ہے کہ وہ حقیقت پسندانہ راہ اختیار کریں اور یہ سمجھیں کہ حاکموں اور محکوموں کے مفاد کو یکساں متصوّر کرنے پر یقین رکھنا غلط ہے اور یہ انہیں مجبوراً اپنے ہی مفاد کو مدِّنظر رکھنا ہوگا۔ ؎۱

اس منظر کشی پر بھی غور کریں:۔

'On his return when he was passing through the kallah Gosh Pass, he was riding by the side of a beautiful brook, and was fasinated by its bright clear water gently playing on its stony bed and bubbling along in soothing harmony. A few small fishes, now lurking in a sheltered cavity, and now emerging to swim with the current or to stem it, fully enjoying their undisturbed element, had given additional life and lustre to the stream. This simple beautiful play of naked nature, in which it indulges in remote sequestered quarters, unhaunted and uninterfered by man, charmed him, and he ordered a halt there for the night. After refreshing himself with a cup of tea he returned to the brook, and caught some fish. The poetry of the place effected him. When fish was brought out of its element, and ceased to live, he dwelt on the uncertainty of life and remarked, 'Thus we cease to exist when the hand of death suddenly lifts him out of his element of life'. Perhaps he had a premonition of his approaching death. *

* A Brief Political History of Afghanistan' Vol:III Page 233

ترجمہ:۔

" امیر حبیب اللہ خان جب واپسی پر کلاہ گوش کے درّے میں سے سوار گذر رہا تھا تو اس کی نظر بہتی ہوئی ایک خوبصورت ندّی پر پڑی۔ وہ اس کے صاف اور شفاف پانی سے بہت مسحور ہوگیا۔ وہ پانی پتھریلے فرش پر آہستہ آہستہ اٹکھیلیاں کرتا

(؎۱ اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچوئیشن ان سنٹرل ایشیا' صفحہ ۲۳۷)

اور ایک سکون اور ہم آہنگی کے ساتھ بسر کرتا چلا جا رہا تھا۔ چند ننھی ننھی مچھلیاں کبھی تو غارنما پناہ گاہوں میں جا چھپتیں اور کبھی ان میں سے پھر نمودار ہو کر پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرنے لگتیں اور کبھی بہاؤ کے خلاف تیرتیں۔ یہ مچھلیاں اپنے بے خلل محیط میں پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں جس سے ندی کو ایک اضافی زندگی اور چمک دمک مل گئی تھی۔ اس سب کچھ سے عریاں فطرت کا ایک سادہ و حسین کھیل کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ یہ فطرت کا ایسے دور افتادہ علاقہ تھا جو عزلت گزینوں کے لئے نہایت موزوں تھا اور جہاں انسان کے قدم شاذ و نادر ہی پہنچے تھے اور جو انسان کی مداخلت سے مامون رہا تھا۔ ایسے پُرکیف علاقے میں امیر نے ایک رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک پیالی چائے پی کر اپنے آپ کو تر و تازہ کیا پھر وہ ندی کی طرف گیا اور وہاں اس نے کچھ مچھلیاں پکڑیں۔ اس جگہ کے شاعرانہ ماحول نے اسے بہت متاثر کیا۔ جب اس نے ایک مچھلی کو پانی سے باہر نکالا تو اسکی جسم سے روح پرواز کر گئی۔ اس پر امیر زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں ایک سوچ میں پڑ گیا اور پھر وہ بولا انسان بھی اسی طرح مر جاتا ہے جب موت کا ہاتھ اچانک اسکی روح کو اس کے جسم سے اچک لے جاتا ہے۔ شاید امیر کو اپنی آرہی موت کا پیشگی احساس سا ہو گیا تھا۔" [۱]

ڈاکٹر صاحب کی منفرد طرزِ تحریر کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی عبارت آرائی کے دوران بعض فارسی اشعار کو انگریزی اشعار میں بدل لیتے ہیں۔ یا کسی فارسی ضرب المثل کو انگریزی میں ڈھال لیتے ہیں، چند نمونے ملاحظہ کیجیے:۔

(1) Beneath a stone lifeless to lie,
With honor, though unknown to fame,
Is better than to live a king,
Honoured but by the crown of shame.*

(2) With neighbour's aid the paradise to gain
Is just like tortures of hell to sustain.

---

۱ "دے بریف ہسٹری" جلد سوم صفحہ ۲۳۳

(3) I'am monarch of all I survey;
I rule the land, I rule the waves.
My right there is none to dispute;
kings, Presidents are all my slaves.

---

*'A Review' P 227.

ترجمہ :۔

(۱) " کسی شخص کا بہت سارے پتھروں کے نیچے کسی غار میں گمنامی کے عالم میں مگر باعزت طریقے سے بغیر سرگرمی کے پڑے رہنا ایسا بادشاہ بننے سے بہتر ہے جو شرم اور بے ناموسی کا تاج پہن کر لوگوں سے اپنی توقیر کرلے۔ ('اے ریویو' صفحہ ۳۷)

(۲) خدا کی قسم خودداری، غیرت اور پامردی کے اعتبار سے ہمسائے کی امداد سے بہشت میں جانے سے یہ بات بہتر ہے کہ آدمی دوزخ میں رہ کر اسکی اذیت برداشت کرے۔ ('اے ریویو' صفحہ ۲۲۴)

اصل شعر یہ ہے :۔

ع

حقّا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است

رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

(۳) جہاں جہاں میں نگاہ ڈالتا ہوں اُسے میں اپنی شہنشاہیت کے زیرِ تسلط پاتا ہوں۔ کیا بَرّ اور کیا بحر سبھی پر میری حکومت ہے اور کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو میرے اس بادشاہی حق کے بارے میں مجھ سے جھگڑا کر سکے۔ بڑے بڑے سلاطین اور صدور میرے ماتحت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی جادو بیانی اس تذکرے سے بھی ہوتی ہے، جو ان کے حاسدوں اور سازشیوں نے امیر حبیب اللہ خان کے سامنے کیا: "حضور والا! ڈاکٹر جادوگر ہے، جو شخص اس کے پاس جاتا ہے اور اس کا کلام سنتا ہے فوراً اس کے ساتھ متفق الرائے ہوجاتا ہے۔"[۱]

ڈاکٹر محمد عبدالغنی روزنامہ کامریڈ کے مدیر اعلےٰ مولانا محمد علی جوہر کی طرح مقناطیسی اثر والی زبان رکھتے تھے۔ اس مقام پر یہ بتا دینا بھی بھلا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی مولانا محمد علی جوہر صاحب کے کامریڈ کی طرح کے ایک روزنامچے کا نمونہ بنا کر امیر حبیب اللہ خان کے سامنے پیش کیا تھا ڈاکٹر صاحب نے لکھا۔ "امیر صاحب نے یورپ کے متعدد باتصویر رسالے دیکھے ہوئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ افغانستان میں بھی ایک ایسے ہی روزنامچے کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے تاکہ وہ اس اخبار میں اپنے فیشنی گردونواح کے درمیان اپنے فیشنی جاہ وحشم کو پوری آن بان کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بھی دیکھ سکیں اور دوسرے بھی انہیں دیکھ سکیں۔ لہٰذا امیر موصوف نے خواہش ظاہر کی کہ میں ایک روزنامہ مدوّن کروں اور اگر ہوسکے تو اس کی اشاعت باتصویر ہو۔"

ڈاکٹر صاحب کا کلام

انگریزی کلام: حاجی وحافظ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف "ریویو آف دی پولیٹیکل سیچوئیشن ان سینٹرل ایشیا" کے آخری حصے میں موصوف کی چند انگریزی نظمیں ہیں۔ انہیں بمع اردو ترجمے کے یہاں پر پیش کیا جا رہا ہے۔

---

[۱] دیباچہ "فریاد و مینائے مسافر"

AN ELEGY

The Muazzin's sweet melodious call,
When all in nature's silent, calm and still.

'Neath night's dark shroud, that holdeth mankind all
In Somnus' happy thraldom at his will,

From life the chains of slumber shakes away,
And wakes true Muslim from his well-earned rest.

To Allah's house he humbly tends his way,
And prays his honest struggle in life be blest.

Of coming dawn it brings glad news indeed ;
A sad grave note it bears withal a knoll

Of night and day that passed away, decreed,
To fall in dead past, and have played their role.

So ringeth hours away the tower bell
Of Arak palace over yonder gate.

Full oft I hear it in my lon-ly cell,
Full oft it wakes me up to mourn my fate.

Whate'er I hear, whate'er I chance to see :
The sparrow's twitter, or the pariah's howl ;

The kitten's mewing, or the hum of bee ;
The buzz of flies ; the angry Captain's growl ;

The frequent change of guards outside my door ;
The self-assuming pompous havaldars ;

The smiles of some that sympathy assure ;
The scowls of those whome gentleness abhors.

My sukka—Sher—who comes of Mongol race,
His bandy legs and short stout oaken staff,
With hirsute chin and ever packered face
That knows not how to smile or how to laugh,
His reg lar beats, his strange synchronous trade,
His staff and foot in duet played and fell ;
With sun he rose,·with him he sank in bed ;
To me all these the same old lesson tell :—
Years ceaseless roll on world's unending track ;
Their awfull load of griefs, of hopes deferred.
Of honest struggles dishonestly thrown back
By selfish greed the weak by strong deterred,
Consumeth life, all efforts maketh vain ;
The honest struggler, baffled, weary, worn,
Recalls and counts his life-time's loss and gain ;
All blank ! The past for future makes him mourn
The bold rash venturer may hurt a few,
His course soon endeth by his wicked ends.
'Tis cool ambitious planners that but hew
Humanity, yet claim to be its friends.
They're ever nobly thoughtful patron-like ;
To tendrils tender ; but they aim at roots.
And so well directed subtle blows they strike
That all are sapped and blighted, branch, leaf
and fruit.

He holds with fangs of power and claws of pelf
A million human souls an easy prey ;

He makes them dance, yet tunes his harp himself ;
On human wrecks he lives in splendour gay.

A great man he, a lord of vast demesne ;
A dollar-king, or crowned head of State ;

To work for good to men, as he may deign,
Or for his weal to ruin seal their fate.

ترجمہ ۔ نوحہ

مؤذن کی پُرترنم روح افزاء اذان ایسے سمیں میں شروع ہوئی
ہے جب کائنات کی ہر چیز پر سکوت اور خاموشی ہے۔

اندھیری رات نے اپنی چادر کے نیچے تمام بنی نوع انسانوں کو لے
رکھا ہے اور یہ تمام لوگ اپنی رضا و رغبت سے نیند کے گرفتار ہیں۔

(صبح صادق کے وقت) خواب نے اپنی گرفت کو لوگوں کی زندگیوں
پر سے ڈھیلا کرنا شروع کیا ہے اور سچے مسلمان مشکل سے اور محنت سے کمائے گئے آرام
(نیند) سے اٹھ رہے ہیں۔

وہ (اٹھ کر) اللہ کے گھر کی طرف جانے والا اپنا رستہ پکڑ رہے ہیں
اور وہاں پہنچکر اللہ کے حضور میں دعا کرنے والے ہیں کہ زندگی میں ان کی دیانتدارانہ جدوجہد
پُربرکت بن جائے۔

ٹیلے کے پار سے ہونے والی یہ (فجر کی آذان) بے شک پو پھٹتے ہی اپنے
ساتھ خوشخبریاں لاتی ہے مگر ساتھ ہی (بعض وجوہات کی بنا پر) اس میں کچھ غمناک
اور سنجیدہ اشارے بھی ہیں۔

ان مسلمانوں کی زندگی کی راتیں اور دن جوں جوں بیت کر ماضی بنتے

گئے وہ (مسلمان) مشیت الہی کے مطابق اپنا اپنا کردار ادا کرتے گئے۔

اسی طرح کابل کے ارگِ شاہی کے قریب واقع محل کے سامنے والے گیٹ کے برج سے جرس کی آواز گھنٹوں تک جاری رہتی ہے۔

مجھے اکثر اس جرس کی آواز میری قید کی کوٹھری کی تنہائیوں میں صاف سنائی دیتی ہے اور یہ اکثر مجھے علی الصبح اپنی سیاہ بختی پر ماتم کرنے کے لئے بیدار کرتی ہے

قید تنہائی میں مجھے کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی سوائے چڑیوں کی چوں چوں کے یا پھر کسی نجس جانور کی نجس آواز کے۔

ہاں بلی کے بچے کے میاؤں میاؤں کرنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

شہد کی مکھیوں اور عام مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور غصے سے بھرے ہوئے داروغۂ جیل کے گرج کر بولنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

میری کوٹھری کے دروازے کے باہر پہرہ داروں کی وافر اول بدل اور خود پنداری میں مبتلا اور اپنی شان اور رعب کھانے والے حوالداروں کی بابت علم بھی مجھے ہوتا رہتا ہے۔

ارگ شاہی میں بعض اشخاص کی ایسی مسکراہٹیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جن سے ہمارے لئے ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہوتا ہے اور بعض افراد کی ایسی ترش روئی کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ خود شرافت کو ان افراد سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

سُکاّ شیر (جو میری کوٹھری کے آس پاس پہرہ دینے پر مقرر ہے اور جو اپنے آپ کو منگولوں کی نسل سے بتاتا ہے مڑی ہوئی ٹانگوں والا ہے اور اس کے ہاتھ میں شاہ بلوط کی ایک چھوٹی سی مضبوط چھڑی ہوتی ہے۔

اسکی ٹھوڑی پچکی ہوئی اور اس کا چہرہ جھلڑیوں والا ہے اور ان جھلڑیوں کے سبب سے وہ مسکرانے یا ہنسنے سے معذور ہے۔

جب سورج نکلتا ہے تو وہ بھی جاگ پڑتا ہے اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ بھی سو جاتا ہے میرے سامنے سالہا سال سے روز و شب بس انہی چیزوں کی تکرار رہتی ہے۔

دنیا کے لا متناہی نشانات اقدام کی راہ پر ہماری قید کے نہ ختم ہونے والے سال بھی گذرتے جا رہے ہیں۔ ان پر غموں کا اندوہناک بوجھ اور امیدوں کے طویل التوام کا وزن لدا ہوا ہے۔

ہماری دیانت دارانہ کوششیں نہایت بددیانتی کے ساتھ پیچھے پھینک دی گئیں اور خود غرضانہ حرص کے ہاتھوں طاقت ور لوگ ہم جیسے کمزوروں کے لئے سدِ راہ بن گئے ہیں۔

ہماری زندگی ختم ہوتی جا رہی ہے ملّی ترقی کے سلسلے میں ہماری تمام مساعی ضائع گئیں۔ ہم جیسے خلوص و دیانت کے ساتھ جد و جہد کرنے والے افراد پریشان کئے گئے اور ہماری حوصلہ شکنی کرتے ہوئے ہمیں خستہ اور نڈھال کر دیا گیا۔

میں اپنی حیات کے سود و زیاں کو یاد کرتا رہتا ہوں اور اس کا شمار کرتا رہتا ہوں۔ جب اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو اسے بے کیف پاتا ہوں۔ اس کورے ماضی کے ساتھ جب مجھے اپنے مستقبل کا خیال آتا ہے کہ (نہ ختم ہونے والی قید کے سبب سے) میں مستقبل میں بھی اعلیٰ کارکردگی نہیں دکھا سکونگا تو میں ناچار ملال و اندوہ محسوس کرتا ہوں۔

ایک منفی جرأت والا ناعاقبت اندیش مہم جو اپنی اس مذموم مہم کے دوران کئی (بے گناہوں) کو زخمی کر دیا کرتا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد مکّاری پر مبنی ہونے کے سبب سے اُسکی مہم جلدی دم توڑ دیتی ہے۔

اسی طرح ٹھنڈے مزاج کے منتمیّن سازشی (غالباً یہ اشارہ ہوگا مستوفی الممالک محمد حسین، ملّا منہاج الدین اور عبدالکن اور غوندیوال جیسے منصوبہ بازوں کی طرف جنہوں نے ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کے خلاف امیرِ سلطنت کے کان

بھرے ستھے) انسانوں کے لئے شدید کاٹ کا کام کرتے ہیں مگر ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ہم تو انسان دوست ہیں۔

ایسے بدبخت افراد اپنے آپکو ہمیشہ دوسروں کے لئے فکرمند سرپرست ظاہر کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ دوسروں کی بنیاد اکھیڑنے والے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی بیل کی شاخ کا محافظ بنکر اسکی جڑ کاٹے۔

یہ دون فطرت افراد نشانہ باندھ کر بظاہر نامعلوم مگر اندر ہی اندر گھائل کر دینے والے ایسے وار کر جاتے ہیں کہ ان کے یہ تمام وار مضروب کا اندر کھوکھلا کر چھوڑتے ہیں اور یہ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں اور پھلوں کے معاملے میں پت روگ۔

وہ درندہ صفت (مقتدر) اپنے طاقتور زہریلے دانت اور پنجے استعمال کرکے لاکھوں نفوس کا باآسانی شکار کر لیتا ہے۔

وہ یہ ڈھول بجاتے ہوئے زیردست لوگوں کو اس دھن پہ ناچنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اسی طرح وہ بہت سے انسانوں کو برباد کرکے خود پرست و پرشکوہ زندگی گذارنے کے لئے اُن کھنڈروں پہ شاندار محل تعمیر کراتا ہے۔

وہ بڑا آدمی ہے اور وسیع سلطنت کا مالک ہے۔ اسے ڈالروں کا بادشاہ کہیئے (کیونکہ وہ اتحادی طاقتوں جن میں برطانوی حکومت بھی شامل ہے کا ساتھ دینے یا غیر جانبدار رہنے کے صلے میں ان سے بہت سے ڈالر وصول کرتا ہے) یا اسے اپنی سلطنت کا تاجدار کہہ لیجیے (اغلباً اشارہ امیر حبیب اللہ خان کی طرف ہے)

وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ لوگوں کی بہتری کے لئے جو اقدام مناسب سمجھتا ہے کرتا ہے اس کے یہ تمام نہاد مناسب اقدامات درحقیقت لوگوں کی قسمت کو تباہ کرکے یا اسے سربمہر کرکے اپنی بہتری کرنے کے لئے ہیں۔

APPEAL

Ye faithful sons of India's clime !
For centuries ye have but lived in vain ;
Your ancestors, who wisely lived with Time,
Built empires great, and sought still more to gain.
Wherever is the earth by faithful trod,
Wherev'r is heard Muazzin's chanting call,
The magic spell of 'There's no God but God'
In one great Muslim Nation bindeth all.
Long have ye dwelt on glories won and gone,
While races, whom your arms did hold in sway,
Your mighty yoke have thrown off, one by one,
And have now marched on you in war array.
Your bitter foes, the foes of Unity,
Their poisoned shafts lodged subtly in your flanks,
While glare of grandeur and prosperity
Had turned the heads of serried Muslim ranks.

God stood by you while by Him ye did stand,
Your hosts were God's own hosts, ov'r earth ye reigned.
Bewitched by earthly pomp and power grand
Him ye forsook, and lost what ye had gained.
Your wary cunning foes perceived you swerve,
Your vanity with honeyed speeches fed,

Your senses dulled, and poisoned all your nerve ;
Blindfolded thus to ruin were ye led.

'The foes of Unity, united all,
Have pierc'd your hearts the deepest that they could

With spiteful sabre, and revengeful ball ;
Behold your moral weakness spill your blood !

Your sacred home they menace to disgrace ;
Your life your faith, your honour are at stake ;

Your name from earth they threaten to efface ;
Rouse fallen breth'ren, off your slumber shake.

Ye fear ye cannot move your limbs with ease ;
They're well-nigh atrophied, your heart beats ill ;

I know ye have an organic disease,
But will your rise, and surely rise you will.

Think ye what had of old your fathers done ;
Think ye what they have left for you to do ;

In Faith they lived, for Faith they fought and won ;
The same good legacy they've left for you.

We were content with what we had of crown ;
Nor we contend with any race their land

or liberty ; and colour, white or brown,
Offends us not ; it is our Painter's hand.

Ye know that strong and God-made ties
Unite us with the rest of Muslim world ;

When lands resound with Muslim groans and cries
Through darts quite unprovoked at them hurrl'd,

We deeply feel for them—our hearts are rent,—
And humbly call for Heaven's vengeance just
To ruin wretches on our ruin bent,
And jointly struggle to bring the foe to dust.

On Time's ev'r-rolling ocean floats your bark,
By gales of stormy human passions toss'd,
Here struck 'gainst rocks, there charged by shoals of shark,
Mid warring raging elements self-lost.

By Europe's dreadnoughts threaten'd to be sunk,
Scowled on, surpassed by common boats in race
And outmanoeuvred ev'n by pilots drunk,
Death-loaded storm upgath'ring in her face.

Ill-manned, ill-piloted, she floats about,
Now rocking to and fro, now driv'n aside,
Now gath'ring steam and ready, but in doubt,
Now careless would she fatal billows ride.

Now taking Charybdis for rock of hope,
Mistaking Soylla for a home of light,
With shattered oar, with tattered sail and rope,
With either wind or wave unfit to fight.

Your Muslim bark is this, and such her plight,
So long by Turkish men and pilots led.
They are sadly crippled ; you cannot fight :
Rebuild her now for social struggle instead

"Who's that to God a goodly loan would lend !
"To Him will He return it manifold,

"For God reduceth, and He doth extend,
"(His gifts to man)". [1]His treasures are untold.

No doubt the poor your charity do need,
But most of them are mendicants ye know.

Why undeserving mendicancy feed?
By noble efforts organised, though slow,

Your breth'ren from such degradation save,
And let them by their honest labour learn

How by the use of head and hands they have,
An independent living they can earn.

"Tis wrong these human drones to help to live.
Ye help their degardation and your own;
To lift them from their mis'ry freely give,
But make no man a legatee of drone.

Now come ye noble sons of fathers great,
Your faith, life, hope your all's endangered now,
Now come ye noble sons of fathers great,
Your faith, life, hope your all's endangered now,

No longer tarry ye, nor hesitate,
Disturb your minds no more with why and how.

Give tithes for God, the King of Kings, that He
Be pleased and give you more: help ye His cause,

For thus ye help yourselves and be
A nation great and honoured as it was.

Ye have your millionaires, thank God, with zeal
And energy such work to undertake.

What is our goal on earth but Muslim weal?
Open your heart and hands for Allah's sake.

---

1. Chapter Baqarah, the Cow, Verse 245.

In what you do and say—in all your life—
To God, to your faith, be loyal and true ;
Keep to the right path in life's struggle and strife ;
"Eat, drink, but waste not" :—this much is your due.
Let God and Prophet your disputes decide.[1]
'Tis shame for us to seek another door
Than God's ; to us' tis always open wide.
Why should a Muslim his own just law ignore ?
In your own schools let your children be taught
To be like those heroes who lived to make
Islam, and in their lives on us its blessings brought.
Be firm, let naught your resolution shake.

---

1. And if ye dispute with each other in any matter, refer it to God and His Messenger if ye (are true Muslims and) believe in God and the Last Day ; this is good for you, and the best way in the end. (Chapter Nisa—women—verse 59).

مادرِ وطن (پاک و ہند) کی آب و ہوا میں پلے ہوئے مسلمان بیٹو! تم نے زندگی کی کئی صدیاں بیکار اور بے فائدہ گذار دیں۔

تمہارے اجداد وہ تھے جنہوں نے وقت کا بڑی عقلمندی سے مصرف کیا اور جنکی ہمت اور جوشِ جہاد سے بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں اور پھر بھی انہوں نے بس نہیں کیا بلکہ (اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے) مزید سلطنتوں کے حصول کی جدو جہد کرتے رہے۔

جب اسلام کا سنہری دور شروع ہوا تو یہ صورتحال ہو گئی کہ جہاں کہیں بھی کوئی خطۂ زمین ہے سمجھ لو کہ وہیں مسلمانوں کے قدم پہنچے اور جو جو جگہ ہے گویا وہیں پہ مؤذن کی دلآویز گونج سنائی دی۔

یہ لا الٰہ الا اللہ کی مقناطیسی کشش ہی تو ہے جو تمام مسلمانوں کو ملتِ واحدہ کی صورت میں یکجا رکھتی ہے۔

اے مسلمانو! تم ایک بہت لمبے عرصے تک بڑی شان و عظمت سے ہمکنار رہے۔ یہ عظمت آئی، رہی مگر پھر بتدریج جاتی رہی کیونکہ وہ اقوام جن کو تمہارے اجداد نے مدتوں اپنے زیرِ اقتدار رکھا آہستہ آہستہ تمہارے تسلط کا جوا پھینکتی چلی گئیں اور اب یہ حالت ہے کہ وہ تمہارے مدِ مقابل لشکر کش ہو رہی ہیں۔

تمہارے بدترین دشمن وہ ہیں جو تمہارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں، تبھی وہ اپنے زہریلے تیر تمہارے پہلوؤں کو شدید گھائل کرنے کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔

جب تک نماز کے لئے صفوں میں شانہ بشانہ کھڑے اللہ کے بندے

اللہ کی کبریائی کے آگے اپنے سروں کو جھکاتے رہے اس وقت تک ان کی خیرہ کن عظمت اور خوشحالی کا دور دورہ رہا۔

جب تک تم مسلمانوں نے اللہ کا ساتھ دیا اس نے بھی تمہارا ساتھ دیا اور اس عرصے میں تمہارے لشکر دراصل اللہ کے لشکر تھے۔

تم مسلمان اب دنیاوی طاقت و شکوہ سے فریفتہ ہو گئے ہو۔ تم نے اللہ کو چھوڑ دیا ہے اس کے نتیجے میں تم نے جو کچھ اللہ کے فضل و کرم سے پایا تھا وہ سب کھو دیا ہے۔

تمہارے جنگ جو مکار دشمن تمہارے راہ راست سے انحراف کرنے کو بھانپ چکے ہیں انہیں پتہ ہے کہ تمہارے نیک اعمال اب باقی نہیں رہے۔ وہ منافقانہ طور پر تمہارے غرور دلی کی تسکین کی خاطر تمہارے سامنے شہد کی طرح شیریں تقریریں کرتے ہیں۔

تمہارے حواس جواب دے چکے ہیں اور تمہاری نسوں پہ بے عملی کے زہر کا اثر ہے۔ تم نے گویا اپنی چشم بینا پہ پٹی باندھ رکھی ہے اور یوں تم تباہی کے گڑھے کی طرف ہر آن بڑھتے چلے جا رہے ہو۔

تمہاری یگانگت کے تمام دشمن آپس میں متحد ہو چکے ہیں اور انہوں نے تمہارے قلوب کو اتنی گہرائی تک چھید ڈالا ہے جتنی گہرائی تک کہ ان سے ممکن تھا۔

وہ بغض و عناد کی شمشیر استعمال کر کے اور رقص و سرود کی محفلیں جما کر تم سے بدلہ لینے کی غرض سے اور تمہارا خون بہانے کی نیت سے تمہاری اخلاقی کمزوریوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

وہ تمہارے مقدس گھر کی بے حرمتی کرنیکی دھمکیاں دیتے ہیں۔

تمہاری زندگیاں، تمہارا ایمان اور تمہاری آبرو خطرے میں ہے۔

وہ روئے زمین سے تمہارا نام نیست و نابود کر دینے کی دھمکیاں

دیتے ہیں رائے زوال آشنا بھائیو! اپنے خواب غفلت کو اپنے سے دور کر دو
تمہیں اس بات کا خدشہ ہے کہ تم اپنے اعضاء کو آسانی سے
حرکت نہیں دے سکتے اور یہ کہ وہ بہت زیادہ ناکارہ ہو گئے ہیں اور یہ کہ
تمہارے دلوں کی دھڑکنوں میں سست روی آ گئی ہے ۔
مجھے علم ہے کہ تمہیں عضوی بیماری ہے مگر کیا تم ہمت سے اٹھو گے
نہیں! مجھے یقین ہے کہ تم ضرور اٹھ کھڑے ہو گے ۔
ذرا سوچو کہ تمہارے آباؤ اجداد نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام
دیئے اور یہ بھی غور کرو کہ انہوں نے تمہارے کرنے کو کیا کام باقی چھوڑے ۔
وہ دین و ایمان کی زندگی گذار گئے ، دین و ایمان کی خاطر ہی
انہوں نے جہاد کئے اور کامیابیاں حاصل کیں ۔ وہ (ایسی عمدہ طرزِ زندگی کا) ترکہ
اپنے پیچھے تمہارے لئے چھوڑ گئے ۔

ہم تو بس اسی پر قانع ہو گئے جو ہمیں تاج برطانیہ (کی نظر کو
خیرہ کرنے والی تہذیب و ترقی) سے ملا ۔ ہم نے آج کی اقوام و ممالک میں
کسی کی ترقی سے سبقت لے جانے کی سعی نہیں کی ۔
اور نہ ہی ہم حصول آزادی کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں
ہمیں کسی قوم یا نسل کے گورا ہونے یا بھورا ہونے سے ہرگز کوئی کد نہیں
کیونکہ یہ تو خدائے عزّوجل کے نقش و نگار کرنے والے ہاتھ نے جس طرح
چاہا کر دیا ۔
اے میرے ہم وطن مسلمانو! تمہیں تو بہتر ہی ہے کہ اللہ کی مضبوط
رسی ہمیں باقی عالم اسلام سے وابستہ و متحد کئے ہوئے ہے ۔
جب مسلم ممالک کے مسلمان ان تیروں کی بوچھاڑ سے کراہتے اور
چیخیں مارتے ہیں جو بغیر کسی اشتعال و جواز کے ان پر برسائے جاتے ہیں اور ان
کی آہ و بکا سے دھرتی گونج جاتی ہے تو برصغیر کے مسلمانوں کو ان پر ڈھلائے جانے

والے مظالم سے بڑا قلق ہوتا ہے۔ اور ہمارے دل نہایت کرب محسوس کرتے ہیں اور ہم خدائے عادل کے آگے عاجزانہ گڑگڑاتے ہیں کہ وہ ان ظالموں سے بدلہ لے۔

ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہم مسلمانوں کو مل کر ان ذلیل دشمنوں کو برباد کر سکنے اور موت کی نیند سلا سکنے کی توفیق دے جو ہماری بربادی پر تلے ہوئے ہیں۔

وقت کے سمندر کی ہمیشہ سے آگے کو بڑھنے والی لہریں ہمارے بیڑے کو تیراتی چلی آئی ہیں، البتہ دوسری قوموں کی مذموم خواہشات کے طوفان اس بیڑے کو اچھال کر پرے پھینک دینے کے حیلوں میں لگے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ بیڑا کہیں پر تو سمندری چٹانوں سے ٹکراتا رہتا ہے اور اور کہیں شارک مچھلیوں کے ہجوم اس پر حملہ آور ہونے رہتے ہیں اور یہ بیڑا غیض و غضب سے پُر باہمی آویزش میں مبتلا عناصر کے جھگڑے میں خود فراموش اور راہ گم گشتہ سا ہو گیا ہے۔

اس بیڑے کو یورپ کے وہ جنگی جہاز بھی ڈبو دینے کی دھمکی دے رہے ہیں جو بیسویں صدی کے اوائل میں معرض وجود میں آئے۔ بہر حال یہ بیڑا مخالفوں کے بگڑے ہوئے تیوروں کو برداشت کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے، مگر یہ اتنا سست رفتار ہے کہ عام کشتیاں بھی اس سے آگے نکل رہی ہیں۔

حتیٰ کہ لندن میں دھنت دشمن جہاز رانوں کی فوجی چالیں بھی اس بیڑے والوں کی چالوں کو مات دے گئی ہیں اور اس بیڑے کے افراد کے چہروں سے ایک ایسا طوفان عیاں ہو رہا ہے جو موت کا تابوت اٹھائے ہوئے ہے۔ اس بیڑے کے کپتان اور ملاح ناتجربہ کار، نافہم اور نادوراندیش ہیں۔ یہ بے چارا بیڑا اسی بدحالی میں بہا چلا جا رہا ہے۔ کبھی تو آگے پیچھے کو جھولتا ہے

اور کبھی اس کو دائیں بائیں ہچکولے لگتے ہیں۔

اب اس میں بھاپ بھر دی گئی ہے اور روانہ ہونے کے لئے یہ تیار کھڑا ہے مگر روانگی کے لئے جس عزم، مستعدی اور تیقن کی ضرورت ہے وہ اسمیں مفقود ہے اور پھر یہ کہ چلنے کے دوران یہ اس امر سے لاپرواہ ہو جاتا ہے کہ راستے میں کہیں مہلک تلاطم خیز لہروں پر تو نہیں چڑھ جائیگا۔

اس بیڑے والے کبھی تو کسی گرد باد کو امید کا نشان سمجھ لیتے ہیں اور کبھی کسی چٹان کو مینار نور قرار دے دیتے ہیں۔

اس کا چپو ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اور بادبان اور رسا بوسیدہ ہے اور یہ چیزیں ہوا اور لہروں کی مدافعت نہیں کر سکتیں۔

تم مسلمانوں کے اس بیڑے کی یہ ہے خستہ حالی جس کے چلانے کا کام اینک ترک افراد اور ملاحوں کے ہاتھوں میں رہا۔

وہ ترک ملاح تو اب بری طرح معذور ہو چکے ہیں۔ اور وہ اب دشمنوں سے لڑ سکنے کے اہل نہیں ہیں لہذا اسکی بجائے اپ آپ کو سماجی جدوجہد کا مقصد شروع کرنے کی خاطر اس بیڑے کی تعمیر نو کر لینی چاہیئے۔

" کون ہے جو اللہ کو قرضہ حسنہ دے؟ اللہ اُسے وہی قرضہ کئی گنا کر کے لوٹائیگا۔ اللہ کو اگر تم کم صورت میں دوگے تو وہ اسے بڑھا چڑھا کر واپس کرے گا" یہ عطائے خداوندی ہے۔ اس کے خزانے بے حدو حساب ہیں" (بحوالہ سورۂ بقر۔ سورہ ۲۴۵)

اس میں شک نہیں کہ غرباء کو تمہاری خیرات کی ضرورت رہتی ہے مگر تم جانتے ہو کہ ان حاجت مندوں میں سے اکثر گداگر ہوتے ہیں۔

تم لوگ ان نامستحق بھکاریوں کو کیوں کھلاتے ہو؟ یوں کرو کہ کسی احسن، منظم اور مدبرانہ طریقے سے (خواہ اس طریقے پر عمل پیرائی کی رفتار شروع میں مدہم ہی ہو) مساکین اور حاجت مندوں کی اعانت کرو۔

اپنے بھائی بندوں کو ذلت و مسکنت کی زندگی سے بچاؤ
اور انہیں دیانت دارانہ محنت و مشقت سے روزی کمانا سکھاؤ۔
انہیں سمجھاؤ کہ وہ کس طرح اپنی عقل سے اور ہاتھوں کی محنت
سے روز بنہ کما کر بے محتاج زندگی گذار سکتے ہیں۔

یہ فعل غلط ہے کہ تم ایسے بے کار اور دوسروں کے سہارے پر
جینے والے نفوس کو زندگانی گذارنے میں مدد دیتے رہو۔ تم فقط انہیں ذلت کی
زندگی بسر کرنے سے چھٹکارا دلوانے میں ان کی کمک کرو اور ساتھ ہی ساتھ اپنے
آپکو بھی افلاس اور نکبت کی زندگی سے محفوظ رکھو۔

ہاں، ان لوگوں کو افلاس کی مصیبت سے باہر نکل سکنے کی خاطر
دل کھول کو امداد دو مگر ساتھ ہی ساتھ خیال رہے کہ ان میں سے کوئی شخص دوسروں
پر مسلسل انحصار کرنے کو ورثے کے طور پہ نہ اپنالے۔

اے عظیم اب وجد کی رشید اولاد! توجہ کرو تمہارا دین، تمہاری حیات
اور تمہاری آرزوئیں سبھی کچھ خطرے میں ہے۔
اب مزید توقف سے کام نہ لو اور نہ ہی کشش و پنج میں پڑو
اور اپنے قلوب کو 'کیوں' اور 'کیسے' کے سوالات سے پریشان مت کرو۔
اللہ تعالے کے لئے عشر نکالو۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔
وہ تم پر خوش ہو کر تم کو اور زیادہ عطا کرے گا۔ مگر پہلے اس کے دین
کے فراز کے لئے کوشاں بنو۔
ایسا کرنے سے تم گویا اپنی مدد خود کرو گے اور اس طرح
ایک بڑی اور باعزت ملت بن سکو گے جیسے کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔
تمہاری قوم میں کروڑ پتیوں کی کمی نہیں۔ اس پہ اللہ کا شکر
ادا کرو۔ یہ صاحبان ثروت سرگرمی اور قوت سے درپیش عظیم کام کی انجام
دہی میں بہت ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس زمین پر ہمارا مطمع نظر مسلمانوں کی بہبود کے سوا اور بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ اے مسلم لوگو! اپنے دل اور ہاتھ کو اللہ کی رضا کے لئے کھول لو۔ اپنی تمام زندگی میں جو کچھ کرو اور جو کچھ کہو اس میں اللہ اور اس کے دین کے ساتھ وفادار اور سچے رہو۔

زندگی کی جدوجہد میں راہِ مستقیم پر گامزن رہو، کھاؤ، پیو مگر اسراف نہ کرو، بس یہ کچھ تمہارے اوپر واجب ہے۔

اپنے اختلافی معاملات میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے فیصلہ مانگو، ہمارے لئے یہ بہت شرم کی بات ہوگی اگر ہم اپنے نزاعی مسائل کو حل کرانے کے لئے کسی اور کے دروازے پر لے جائیں۔

(بحوالہ سورۂ نسا آیہ ۵۹)

جب اللہ کا صریح قانون، دستور العمل (قرآن مجید) ہمارے پاس موجود ہے جس میں ہر مسئلے کا حل بالوضاحت مل سکتا ہے تو کیوں ایک مسلمان عدل و انصاف پر مبنی اپنے اس قانون کو کیوں نظر انداز کرے۔

اپنے مدارس میں تم اپنے مسلمان بچوں کو اس طرز پر تعلیم دو کہ وہ اس تعلیم سے اپنے اجداد کی مانند اسلام کے ہیرو بن سکیں۔

اسلام ہمارے اجداد کی زندگیوں میں اپنی برکتیں اور رحمتیں لایا، تم مضبوط ارادے کے مالک بنے رہو اور اپنے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دو پھر دیکھو کہ اسلام ہماری زندگیوں میں بھی اپنی برکتیں اور رحمتیں لائیگا۔"

دینداری

ڈاکٹر صاحب کے والدِ ماجد مولوی عبدالصمد (سوندی خاں/ اللہ لوک) نے اپنے چاروں بیٹوں (مولانا نجف علی، ڈاکٹر محمد عبدالغنی، حکیم غلام حیدر اور مولوی محمد چراغ) کی تعلیم و تربیت دینی خطوط پر کی تھی۔ مولوی عبدالصمد صاحب مرحوم و مغفور کا گھرانہ دینی گھرانہ تھا۔ وہ خود عربی اور اسلامی علوم میں حظِّ وافر رکھتے تھے اور اپنے اسکول میں اپنے شاگردوں کو علومِ دینیہ سے بہرہ ور کرتے تھے۔ اُن کی اہلیہ (ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ) گھر میں محلے کے بچوں، بچیوں اور عورتوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ ان کی قابل کاشت زمین کی پیداوار سے اور اسکول کی ملازمت سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی بالخصوص جب اس آمدنی میں ان کی دینداری کی برکت بھی شامل تھی۔ بنا برایں پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں میں سے جو افلاس زدہ ہوتے ان کے خورد و نوش اور ان کے پہناوے کے لیے ان کی اعانت بھی کی جاتی تھی۔ یہ منطقی امر ہے کہ جب وہ (مولوی عبدالصمد صاحب اور ان کی خاتون خانہ) دوسروں کی تعلیم و تربیت کا اتنا خیال رکھتے تھے تو وہ اپنی اولاد کو دینی رنگ میں رنگنے کا بھلا کیونکر اہتمام نہ کرتے۔

عاصی برادران (مولانا نجف علی عاصی، ڈاکٹر عبدالغنی، مولوی غلام حیدر اور مولوی محمد چراغ) بچپن ہی سے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے برادرِ اکبر مولانا نجف علی خاں جب ابتدائی تعلیم مکمل کر کے گجرات کے مشن ہائی سکول میں پڑھنے جاتے تھے اور ہفتہ بھر گجرات میں اپنی ایک پھوپھی صاحبہ کے ہاں قیام کرتے تھے تو ایک دن انکی پھوپھی صاحبہ نے کہا، برخوردارو! اگر تم نے میرے ہاں رہنا ہے تو نماز کی پابندی کرنی ہوگی۔ اس دن سے یہ بھائی نماز باجماعت کے اتنے پابند ہوئے کہ زیست کے آخری دم

تک صحت میں اور علالت میں، سفر میں اور حضر میں، آزادی میں اور گرفتاری میں نماز کو کبھی ترک نہ کیا بلکہ جوانی کے ایام سے لیکر دم واپسین تک پنج وقتہ نماز کی ادائیگی کے علاوہ سحر خیزی کے خوگر رہے اور اللہ کے آگے تضرّع وزاری ان کے ہر یوم کا مطلع بنا۔

ڈاکٹر صاحب نے انگلستان میں اپنے قیام کے دوران مغربی تہذیب کے مضرت رساں اثرات کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیا۔ علامہ اقبال کے اس مصرعہ

ع

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

کے مصداق انہوں نے صوم وصلوٰۃ سے تغافل نہیں برتا اور اسلامی اقدار سے بیزاری اختیار نہیں کی۔

یہ اسلام سے والہانہ محبت اور امت مسلمہ کے ساتھ ان کے گہرے قلبی لگاؤ کے سبب ہی تھا کہ انہوں نے لندن میں دارالعوام (HOUSE OF COMMONS) کے اجتماعات میں وقتاً فوقتاً خلافتِ ترکیہ کی حمایت میں حکومتِ برطانیہ پر کڑی تنقید کی۔ اس سلسلے میں انہیں یہ قربانی دینی پڑی کہ حکومتِ برطانیہ نے اُن کا سٹیٹ سکالرشپ بند کر دیا۔

ان کا یہ عمل بھی تو دین مبین کے ساتھ ان کے عشق کا مظہر ہے کہ انگلستان سے ہندوستان کو اپنی واپسی پر برطانوی ہند کی حکومت کی طرف سے سیکرٹری برائے وائسرائے ہند کے عہدے اور جاگیروں کی پیشکش کو ٹھکرا کر انہوں نے مسلم ملک افغانستان کی خدمت کرنے کو ترجیح دی ہے اور ان کی ایسی بہت سی دوسری گراں قدر قربانیاں فقط ان کے شدید دینی جذبے کی بنا پر عمل میں آسکیں۔

کابل میں ڈاکٹر صاحب کے ہمعصر مولوی عبدالواسع کا بیان ہے کہ میں نے ڈاکٹر عبدالغنی کو اس سے پہلے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ جب میں نے ملسے ارگ شاہی کابل (قید خانہ کابل) میں دیکھا اور پہنچانا تو اسے مغربی مشرب کا حامل پایا، موصوف کا یہ بیان مبنی بر حقیقت نہیں کیونکہ بہت سے شواہد جنکا ذکر کتاب ہذا میں جا بجا ملتا ہے موصوف کے اس جملے کی نفی کرتے ہیں۔

میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا جو ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں میں سے تھے ان کے تقوے اور علم و فضل کے رطب اللسان ہیں۔ علامہ حاجی اسد جن کے مراسم ڈاکٹر صاحب سے بڑے گہرے تھے لکھتے ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں بہت تکالیف دیکھیں مگر ان کے راسخ عقیدے اور قوت ایمانی میں کبھی کچھ فرق نہ آیا' ڈاکٹر صاحب کے ایک ہمکار پروفیسر محمد حسین جالندھری کہتے ہیں کہ ان کی علمی اور اخلاقی لیاقت مسلّم تھی [۱] عبدالحئی حبیبی کا کہنا ہے کہ 'ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ وہ افغانستان میں انگریزوں کے مفادات کے لئے کام کر رہے تھے کیونکہ وہ افغانستان میں جو ملی خدمات انجام دے رہے تھے، وہ درحقیقت انگریزوں کے مفادات کے منافی تھی [۲] اس طرح کی غلط بیانیاں خود انگریزوں کی منافقانہ پالیسی کا ایک حصہ تھیں۔ کیا انگریزوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کے معاملے میں بھی کچھ پیبردل کو کابل اور قندھار میں نہیں بھیجا تھا کہ جا کر نائب السلطنت سردار نصراللہ خان اور گورنر قندھار کو کہیں کہ مولوی عبیداللہ سندھی اور مولوی عبداللہ غاری انگریزوں کے نمائندے ہیں اور سرکاری جاسوس ہیں [۳]

ڈاکٹر عبدالغنی اور ان کے بھائی مولانا نجف علی خان اپنی گیارہ سالہ طویل قید کے دوران بھی اللہ تعالےٰ کی یاد میں مستغرق رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظربندی کے ایام میں قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو ابھی تک غیر مطبوعہ

---

[۱] انقلاب ۲۶ صفحہ ۱۱۰   [۲] جبنش مشروطیت ، صفحہ ۶۶

[۳] کابل میں سات سال ، صفحہ ۷۷

حالت میں ہے۔ انہوں نے انگریزی میں ایسی نظمیں بھی لکھیں جن میں مسلمانوں کو دین کی طرف راغب ہونے اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو آزادی کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے اور معنوی ترقی کرنے کی تلقین کی۔ ان میں سے چند اس کتاب میں بھی شامل کی گئی ہیں فارسی میں اپنا منظوم حبسیاتی تماشا چہ فریاد میائے مسافر بھی بندی خانے میں ہی تخلیق کیا مولانا نجف علی خان عاصی نے فارسی میں منظوم حبسیات لکھیں جن میں بادشاہ اور اپنے فرزند کو پند و نصائح کی گئی ہیں اور نیز دلآویز انداز میں اپنی سیاہ بختی کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انہیں پڑھ کر آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں

۱۹۱۹ء کے معاہدہ راولپنڈی میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی دیانتداری سے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے انگریزی وفد کو گفت و شنید میں نیچا دکھایا اور حکومت افغانستان کے مفادات کے حق میں کامیابی حاصل کی۔ یہ ان کی دینی لگن ہی کا ماحصل تھا کہ جب انگریزوں نے اپنے فارن سیکرٹری سرہملٹن گرانٹ کے ذریعے جو انگریزی وفد کا سربراہ بھی تھا ڈاکٹر صاحب کو ایک لاکھ روپے اور کمشنری کے عہدے کی پیشکش کی[1] تاکہ وہ افغان حکومت کے مفادات کی وکالت و ترجمانی نہ کریں تو ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں پیشکشوں کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ "قیامت کے روز اپنے خدا کے آگے کیا جواب دونگا ایسے مواقع پر جبکہ زرکثیر اور مرتبہ عالی مل رہا ہو بڑے بڑے اصول پرستوں کے ایمان ڈگمگا جاتے ہیں" ہاں اگر کسی مسلمان کی قوت ایمانی محکم ہو اور توفیق من اللہ اسکی ہم رکاب ہو تب ہی وہ ایسے امتحان میں سرخرو ہو سکتا ہے۔ باوجودیکہ افغان حکومت نے امیر حبیب اللہ خان کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی بے جا جامہ تلاشی کرا کے ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی اور اس واقعہ کے چند سال بعد انہیں بے قصور ساڑھے دس برس تک قید سخت کی شدید اذیت دی تھی اور ان بھائیوں

---

[1] بیان رانا ظہور الحق

کی جائیدادیں ضبط کرکے انہیں ناقابل بیان کرب میں مبتلا کیا تھا ڈاکٹر صاحب نے اللہ کو حاضر ناظر جان کر پورے خلوص کے ساتھ افغان حکومت کے مفادات کو کامیاب کرایا بے شک ایسا طرز عمل ایک متقی مسلمان ہی سے متوقع ہو سکتا ہے۔ عبد الرؤف ابن مولوی فیروز الدین کو ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں لکھا "راولپنڈی وہ مقام ہے جہاں مجھے اللہ تعالے نے مخالف پارٹی کو مرغوب کرکے اس پر فتح مبین عطا فرمائی۔ اس وقت بھی میں اب جیسا بے سروسامان تھا" (یہ خط ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو لکھا گیا)۔

۱۹۲۷ء میں یا اس سے ذرا پہلے ڈاکٹر صاحب ہندوستان سے حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہونے کیلئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ حاجی محمد اسد نے لکھا "میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب سے مکہ مکرمہ میں ۱۹۲۷ء میں ملا تھا۔

یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ۱۹۳۲ء میں میں بھی اُسی جہاز میں واپس ہندوستان کو آیا جس میں کہ ڈاکٹر صاحب بھی سفر کر رہے تھے"۔ حاجی محمد اسد صاحب کے اس بیان سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۷ء میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے مکہ مکرمہ کو پہنچے ہوں گے اور ۱۹۳۲ء تک اس مقدس سرزمین میں ہی رہے ہوں گے۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ مولانا نجف علی خان بھی فریضۂ حج سے شرف یاب ہوئے تھے، البتہ یہ امر ابھی واضح نہیں کہ آیا مولانا نے یہ فریضہ ڈاکٹر صاحب سے پہلے ادا کیا یا کہ ان کیساتھ ادا کیا یا کہ بعد میں۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۰ء میں افغانستان کو مکمل طور پر خیرباد کہہ کر اپنے وطن برصغیر پاک و ہند کو آ گئے اور صوم و صلوٰۃ اور دیگر شعائر اسلام پر پوری طرح کاربند رہنے کے علاوہ کئی قسم کے سماجی کاموں میں حصہ لیکر مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے رہے۔ مثلاً جلال پور جٹاں میں ان کی اپنی رہائش گاہ

پر مفلس مریضوں کا مفت علاج کرنے میں وہ دن کا بیشتر حصّہ صرف کرتے۔
عبدالرؤف بن مولوی فیروزالدین کے نام ڈاکٹر صاحب کے خطوط کے یہ
جملے ملاحظہ ہوں، کام بہت ہے، چار گھنٹے صبح اور دو گھنٹے عصر...
مریضوں کی تعداد روزانہ ڈیڑھ سو سے زیادہ... پرسوں تعداد ۱۸۸
ہوگئی تھی۔ دعا کرو خدا مجھے اسکی انجام دہی کے لئے ہر قسم کی توفیق عطا فرماتا
رہے۔ (یہ خط ۲۵ فروری ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔)

سردار نادر خان فرمانروائے افغانستان سے

A BRIEF POLITICAL HISTORY OF AFGHANI-
STAN (4 VOLS).

لکھنے کے سلسلے میں انہیں جو ۲۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ آتی تھی اس میں سے کچھ حصہ (کم و
بیش ۵۰ روپے) اپنے مریضوں کے علاج کے لئے ادویہ خریدنے پر صرف کرتے، گھر کے خرچ
کے لئے کچھ رقم رکھ کر باقی رقم لاہور کے ایک یتیم خانے کو بھیج دیتے تھے اور شاید اسلامیہ ہائی
سکول جلالپور کی بھی کبھی کبھی اعانت کرتے رہتے تھے۔ (دیسے اسلامیہ ہائی سکول جلال پور
کی مالی امداد اور عیدگاہ مسجد جلال پور کے تعمیری خرچ اور دیگر اخراجات چلانے
میں زیادہ حصہ مولانا نجف علی خان کا ہے۔ مولانا نے آبادی کے تمام گھروں کی خواتین
کو کہلا رکھا تھا کہ جب بھی وہ آٹا گوندھنے لگیں تو آٹے کی ایک مٹھی ایک الگ
برتن میں عیدگاہ مسجد اور اسلامیہ ہائی سکول کے لئے ڈالتی جایا کریں۔

ڈاکٹر صاحب صبح صادق کے وقت اُٹھ کر نوافل ادا کرتے۔ گھر
میں ایک قرآن مجید تھا اسے بھی صبح کے وقت پڑھتے اور اس کے حواشی پر انگریزی
میں لکھتے جاتے۔ پانچ وقت نماز کی باجماعت ادائیگی کے لئے تمام بھائی اپنے
اپنے گھروں سے نکل کر محلے کی مسجد (مسجد کمہاراں) میں جمع ہو جاتے۔ جمعہ کی
نماز کے لئے شہر کی جامع مسجد میں جاتے اور حفیظ اللہ شاہ صاحب سے خطبہ

اور مثنوی رومی سنتے۔ شاہ صاحب مذکور بڑے ترنم سے مثنوی مولانا روم[رح] پڑھا کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔[۱]

حافظ قرآن مجید ہونے کی بناء پر ڈاکٹر صاحب نماز تراویح کے سلسلے میں قاری کے پیچھے خود سامع کے فرائض انجام دیتے تھے۔ تراویح کے ختم القرآن کے موقع پر ڈاکٹر صاحب اپنے پاس سے ڈنگے کی میٹھی سونف کی رنگین پڑیاں نمازیوں میں تقسیم کراتے اور اپنے پاس ہی ایک جوڑا تلے والا جوتا ایک جوڑا کپڑے ایک سو روپے نقد اور لفافے میں کچھ پھل قاری صاحب کو پیش کرتے بقر عید پر بڑی باقاعدگی سے دو بکرے قربانی کے لئے ذبح کراتے۔ بکرے منگوانے اور ذبح کرانے کا معاملہ حافظ نور قصاب کے سپرد تھا۔

لکھنؤ کے قریب رہنے والے ایک پیر صاحب حاجی وارث علی شاہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیشوا بنا رکھا تھا۔۔۔۔ سردار نادر شاہ والئی افغانستان نے ایک مرزائی مولوی نور محمد سے ڈاکٹر صاحب کو مناظرے کے لئے کہا۔ جب وہ مرزائی مولوی ڈاکٹر صاحب کے براہین قاطع کے سامنے لاجواب ہوگیا تو والئی افغانستان نے اسے گھوڑے کے پیچھے بندھوا کر گھوڑا دوڑوایا اور اس مرزائی مولوی کو مروا دیا۔[۲]

ڈاکٹر صاحب نے عبدالرؤف کو جو خطوط لکھے اور نیز اپنی ایک عزیز بھتیجی ممتاز بیگم[۳] کو جو خط لکھا ان سب میں بھی ان کے اسلامی جذبات وخیالات ٹپکتے پڑتے ہیں۔ ان خطوط کو اگلے صفحات پر رقم کیا گیا ہے۔ قارئین انہیں پڑھکر خود محولہ امر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ راقم الحروف کو بڑا رنج ہے کہ اس نے اپنے بچپن یا لڑکپن میں شعور کی ناپختگی اور کئی اور وجوہ کی بناء پر ڈاکٹر صاحب اور مولانا صاحب کے حین حیات یا ان کی حیات کے بعد ان کی دوسروں سے خط وکتابت اور دیگر اہم تحریریں

---

[۱] بیان رانا ظہور الحق۔ [۲] بیان رانا ظہور الحق نبیرۂ ڈاکٹر عبدالغنی۔
[۳] رانا ظہور الحق کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی اس بھتیجی سے اس قدر پیار رہا کہ ملتان کے والے کے سالم تانگے پر بلالپور سے معوبدرہ (ضلع گوجرانوالہ) محض ان کو دیکھنے کی غرض سے جاتے اور مل کر اسی روز اسی تانگے پر واپس جلالپور آجاتے۔

نہ سنبھالیں اور وہ مرورِ ایام سے تلف ہو گئیں۔ اگر وہ مواد بھی اس وقت موجود ہوتا تو کتابِ ھذا میں مزید مستند معلومات فراہم کی جا سکتیں۔

عادات و معمولات

:- الحاج ڈاکٹر صاحب مغفور کابل کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے اور اپنے آبائی قصبہ جلالپور میں مستقلاً مکین ہو جانے کے بعد قدرے تبدیل شدہ معمولات کے مطابق زندگی گذارنے لگے۔ وہ رات کے ۳ بجے بیدار ہوتے، قہوہ (سبز چائے) جس کے وہ اپنے قیام کابل کے دوران عادی ہو چکے تھے خود بنا کر نوش جان کرتے۔ پھر تہجد ادا کرتے اور قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے اور ساتھ ساتھ اس کے حواشی پر انگریزی میں لکھتے بھی جاتے۔ نماز فجر مسجد میں باجماعت ادا کرنے کے بعد ناشتہ کرتے ان کا ناشتہ دو نیم جوش انڈوں اور چائے پر مشتمل ہوتا۔ ناشتہ کرنے کے بعد پھر تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے۔ اٹھ کر چند گھنٹے پہلے پہر اور چند گھنٹے پچھلے پہر مریضوں کے علاج کے لئے وقف کرتے۔ انہوں نے زندگی کے اس حصے میں ایلوپیتھک علاج کے ساتھ ہومیوپیتھک علاج بھی شروع کر دیا تھا جیسا کہ ان کے ایک خط سے بھی مترشح ہے۔

کابل کے شاہ نادر شاہ نے ڈاکٹر صاحب کو تاریخ افغانستان (اے پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان) لکھنے پر مقرر کر رکھا تھا اور حق محنت کے طور پر انہیں ۲۵۰ روپے ماہوار کابل حکومت سے آتے تھے اور ۷۵ روپے ماہوار چھوٹے بھائی مولوی محمد چراغ صاحب کو اس کام میں اعانت کرنے کے لئے ملتے تھے ڈاکٹر صاحب اس تنخواہ میں سے کچھ حصہ مریضوں کی دوائیاں خریدنے پر صرف کرتے۔ تنخواہ کا کچھ حصہ لاہور کے ایک یتیم خانے کو بھی بھیج دیتے تھے۔

ختم القرآن ہونے پر قاری کو زری جوتوں کا ایک جوڑا اور کپڑے وغیرہ دیکر رخصت کرتے۔ ختم القرآن مجید کے موقع پر میٹھی سونف یا مٹھائی رنگدار پڑیوں میں بند کرا کے حاضرین میں تقسیم کرتے۔ ؎۱

؎۱ بیان رانا ظہور الحق۔

عبد السیفؔ آتی تو دو بکرے خریدتے تے۔ بکرے خریدنے کیلئے ایک معتمد تعنانی مقرر تھا۔ راقم الحروف نے دیکھا کہ دنبے خریدنے کی بجائے عموماً بکرے خریدنے کو ترجیح دی جاتی بکروں کو قربان کرنے سے قبل انہیں نہلا کر ان کی پشت پر ایسا حاشیہ دار گلدار ریشمی کپڑا ڈالا جاتا جس پر جا بجا شیشے کے چھوٹے چھوٹے رنگدار تمغے لگے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے خوشخط اور خوش پوش تھے وعدہ الیفائی کا بڑا اخیال رکھتے تھے۔ جو کوئی انہیں خط لکھتا مصروفیت کے باوجود اس کا جواب ضرور دیتے اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں پُرجلال تھے جبکہ ان کے برادر اکبر مولانا نجف علی خان صاحب زیادہ نرم خو تھے راقم نے مشاہدہ کیا کہ مولانا صاحب ڈاکٹر صاحب کے مقابلے میں زیادہ متحمل مزاج اور بردبار تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب کسی خرابی کو دیکھ کر قدرے خشمناک ہو جاتے۔

خطوط بنام عبدالرؤف

ایک نوجوان عبدالرؤف جو جلالپور جٹاں کے مولوی فیروزالدین کا فرزند تھا حاجی وحافظ ڈاکٹر محمد عبدالغنی کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ وہ ایک عقیدت مند مرید کی طرح اکثر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کیا کرتا تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں جب وہ جلالپور سے دور تھا، تو اس نے ڈاکٹر صاحب کو کئی خطوط لکھے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے ان کا باقاعدگی سے جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خاصہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب ضرور فرماتے تھے۔ حقیقی عظیم شخصیتیں وہی ہوتی ہیں جن میں اس قسم کی خوبیاں ہوں۔ ان خطوط میں سے صرف وہی خطوط یا خطوط کے وہی حصے اس کتاب میں شامل کئے جا رہے ہیں جن سے قارئین کو کچھ اخلاقی یا ادبی فائدہ پہنچ سکتا ہو یا ڈاکٹر صاحب کی افغانستان سے مکمل واپسی کے بعد ان کی گوشہ نشینی

کے تعمیری مشاغل کی جھلک ملتی ہو۔

(۱)

۲۵ فروری ۱۹۶۲ء

...... جن دلوں کو خدائی الفت نے جوڑا ہو انکو عارضی دنیاوی واقعات متاثر نہیں کر سکتے بلکہ بظاہر جدائیاں ان کے مزید استحکام کا موجب بن جاتی ہیں۔

گر در یمنی و با منی با منی

(ترجمہ:- اگر تم یمن میں رہ رہے ہو مگر ہمارے دل ملے ہوئے ہوں تو گویا ہم ایک دوسرے کی صحبت میں ہی ہیں) اگر ہم اپنے خالق کو ہی اپنا دلی رفیق بنا لیں۔ تو سبحان اللہ۔ کوشش کرو کہ ماسویٰ اللہ سے اللہ کے قرب میں پناہ ڈھونڈو، کیسے خوش نصیب ہو جاؤ گے تم۔

میرے پاؤں کا حال .... الحمدللہ زخم خشک ہو گئے ہیں اور پاؤں کھلا چھوڑ دیا ہے مگر نماز کی نشست میں ابھی وہ پورا دباؤ نہیں کھا سکتا۔ تین جمعوں کی قضا کے بعد گذشتہ جمعہ مسجد میں نصیب ہوا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

کام بہت ہے۔ چار گھنٹے صبح اور دو گھنٹے عصر.... مریضوں کی تعداد روزانہ ڈیڑھ سو سے زیادہ.... پرسوں ۱۸۸ ہو گئی تھی۔ دعا کرو خدا مجھے اسکی انجام دہی کے لئے ہر قسم کی توفیق عطا فرماتا رہے

(نوٹ:- قارئین کو اس مقام پر یہ بتا دینا مناسب ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور نادار مریضوں کا بالکل مفت علاج فرماتے تھے۔)

.... تمہارے متعلق کوئی خواب نہیں دیکھا۔ تمہاری ربائی دیکھی...

خوشا روزے و خرم روزگارے

کہ یارے برخوری از وصل یاری

(۲)

۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء

(نوٹ :۔ جناب ڈاکٹر صاحب کا یہ خط اور ذیل کے خطوط ان کی وفات سے تھوڑی ہی مدت قبل درطہٴ تحریر میں آئے۔ شہنواز ڈائرکٹر کمپیوٹر سیل پشاور صدر نے کمپیوٹر کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کی تاریخ وفات ۲۸ ؍اگست ۱۹۴۳ء اخذ کی)۔

...... پنڈی وہ مقام ہے جہاں مجھے اللہ تعالٰے نے مخالف پارٹی کو مرعوب کرکے اس پر فتح مبین عطا فرمائی تھی۔ اس وقت بھی میں اب جیسا بے سر و سامان تھا .... فتح آزادی حاصل ہوگی .... خدا ایسا ہی کرے۔

(۳)

۱۸ ؍اپریل ۱۹۴۳ء

.... میں لاہور بخیر پہنچا ..... دوست کو ملا ..

... کتاب پیش کی ...... ۱۰ تاریخ کو ہی میرے مریضوں کو میری مراجعت کا حال معلوم ہوا اور وہ آنے لگے۔ اس کے بعد روزانہ پروگرام ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک جس عرصے میں مجھے سر کھجلانے کی فرصت بھی نہیں ہوتی ..... ۴ بجے کے بعد گھر کے مشاغل ..... لاہور میں ڈاکٹر مسعود کے ساتھ بہت کام کیا۔ روزانہ دو دفعہ اس کے پاس جاتا رہا۔ مریضوں کو دکھانا اور غائب مریضوں کے متعلق مشورہ کرنا ....

(۴)

۱۱ مئی ۱۹۴۳ء

.... کل دارے (دارہ چوہدریاں) میں ہم خاکساروں کے فوٹو کے لئے ایک مجمع تھا۔ یہ بڑا دلچسپ اجتماع تھا

فوٹو لیا گیا ...... کاش تم بھی ہوتے ......
قربانی وہی قبول ہے جو راہِ خدا میں ہو

نوٹ ۱:۔ راقم کو مذکورہ بالا خطوط مرحوم عبدالرؤف کے چھوٹے بھائی عبدالباسط سے ملے۔

نوٹ ۲:۔ جناب ڈاکٹر صاحب افغانستان سے واپس آکر کچھ عرصہ تحریک خاکساران سے بھی منسلک رہے۔ وہ علامہ عنایت اللہ المشرقی کی اس عسکریانہ تنظیم سے متأثر تھے۔

وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی علمیت اور ان کی اسلامی خدمت کے بھی معترف تھے۔ صرف ڈاکٹر صاحب ہی نہیں بلکہ راقم الحروف کے جدِ امجد مولانا نجف علی خان بھی علامہ مشرقی اور مولانا مودودی کے علم و دانش سے متأثر تھے۔ راقم کو اپنے بچپن میں گھر کی لائبریری میں خاکسار تحریک سے متعلق کئی رسالے اور مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کے متعدد شمارے ملے۔

خوش نویسی :۔

مرحوم و مغفور ڈاکٹر صاحب بہت خوش نویس تھے۔ کیا اردو کیا انگریزی دونوں زبانوں میں ان کی طرزِ نگارش بہت عمدہ تھی۔ اردو میں ان کی خوش خطی کی ایک جھلک اس منسلک مکتوب سے عیاں ہے جو انہوں نے اپنی ایک عزیزہ بھتیجی کو لکھا۔ مکتوب کے آخر میں دستخط کتنے خوبصورت کئے ہیں۔ انگریزی میں ان کے طرزِ تحریر کے لئے ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ترجمۂ قرآن مجید کی چند سطور بطور نمونہ یہاں پر شامل کی جا رہی ہیں خط کا اچھا ہونا صرف جناب ڈاکٹر صاحب پر ہی موقوف نہیں ان کے دوسرے بھائیوں کے خط بھی بہت نفیس ہیں مثلاً مولانا نجف علی صاحب مرحوم و مغفور کی انگریزی اور اردو میں وہ تحریریں ملاحظہ ہوں جو انہوں نے اپنے فرزندِ ارجمند حافظ عبدالمجید مرحوم کو ان کی ابتدائی زندگی میں انگریزی زبان سکھانے کے سلسلے میں لکھیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلالپور جٹاں ۔ آتوار ۱۹ مارچ ۳۳ء

نور چشمی ممتاز بیگم اللہ تمہارا حافظ و ناصر ہو!

دیدہ بوسی و دعوات مزید ۔ تمہارا پیارا خط ملا ۔ دل بہت خوش ہوا ۔ الحمد للہ جابجا ہیں خیریت سے ہوں ۔ ایک کارڈ عزیزی محمد چراغ کے نام آیا تھا ۔ اسمیں نور چشم قادر کی خونی پیچش کا ذکر تھا ۔ اللہ تعالیٰ اس معصوم کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے اور اسکی والدہ ماجدہ کو اطمینان قلب اور راحت دل بخشے!

عزیزہ نے یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ عزیزہ نور بیگم عید کے بعد تمہارے لینے کے لئے سوہدرے جائیگی اور پھر سوہدرے سے جلالپور جائیگی ۔ لہذا تم دونو اکٹھی آ جاؤ گی انشاء اللہ ۔ تمہارا آنا تو درست ہوا اب سوال یہ ہے کہ تم کب تک ٹھیرو گی ۔ تمہاری والدہ تو دو تین دن کے بعد جانے کا قصد کریگی وہ تمکو لیجانے پر اصرار کریگی اور میرا دل چاہتا ہے کہ تم دیر تک یہاں ٹھیرو ۔ تمہاری والدہ بیشک جلدی واپس جانے کیلئے مجبور ہے مگر تمہارے لئے انکی خواہش کے سوا اور کوئی مجبوری نہیں میرے خیال میں یہ بہتر ہے کہ عزیز عبد الرشید تمہیں سوہدرے سے لاکر یہاں چھوڑ جائے میں اسکے آنے جانے کا کرایہ دیدونگا ۔ پھر جب تمہارا دل چاہے تو عزیزہ نور بیگم یہاں آئے ۔ سب کی ملاقات بھی ہو جائیگی اور پھر تمکو لیکر واپس چلی جائے ۔ اسمیں خرچ زیادہ نہیں ہوگا ۔ غرض میں چاہتا ہوں کہ جتنی مدت ہو سکے تم یہاں ٹھیرو ۔ اسپر تمہاری والدہ کو کوئی اعتراض نہیں کریگا ۔ آیندہ تمہاری مرضی جیسا مناسب سمجھتی ہو کرو ۔

خداوند تمہیں ان دعاؤں کا جو میرے لئے مانگتی ہو جزائے خیر دے اور تمہاری مرادوں کو پورا کرے ۔ بیشک دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ آدمی اسکے ساتھ وابستگی کرے

ہماری دنیا کی عمر ہماری اپنی عمر ہے۔ اور ہماری عمر اللہ تعالیٰ کی دنیا کے عمر کے مقابلہ میں ایک لمحہ بھی نہیں۔ اور یہی ایک لمحہ غفلت میں گذارا تو تمام عمر غارت اور خود انسان برباد اور تباہ۔ ہمارا مقصود معرفت کا حاصل کرنا ہے اور وہ یکسوئی مجاہدات کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی الا ماشاء اللہ۔ اور مجاہدات میں دل کی یکسوئی دنیاوی مشاغل سے کنارہ کشی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔

بہترین طریق حضور سرور کائنات صلعم کے نقش قدم پر چلنا ہے یعنی ہر وقت اللہ کے ساتھ رہے اور وجود دنیا کے مشاغل میں لگا رہے مگر نہ اس طرح وہ ہمیں خدا سے غافل کر دے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں اور زبان سے وہی کام اور باتیں ہوں جو اللہ کی مرضی کے موافق ہوں۔ اور جب دل میں اللہ صاحب کا مقام ہو اور دل کو ایسا پاک صاف ستھرا رکھا جائے کہ وہ اسکے شان بلند کے لائق ہو تو پھر ہمارے تمام اعضا پر وہ خود حکمران ہو جائیگا اور اُس سے کوئی حرکات اپنی خلاف مرضی نہیں ہونے دیگا۔ یہی معرفت ہوگی۔

ان امور پر جب ہم غیر اولی کی دربائی نکتہ کو گرفت انسان اور نور مشیعی رقیہ بیگم الف راللہ بخیر آئندہ کو یہاں ہو گئی گی۔ میں تمہارے یہاں آنیکو اس کے ایک بہت مبارک سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے رنگ میں آ جائے۔ خداوند تم دونوں کے ہاتھ پاؤں اور زبان کو اپنا بنالے اور تمہیں اپنے خاصوں میں داخل کرے آمین۔

کاش کہ میں ان امور میں تمہاری رہنمائی کے قابل ہوتا مگر افسوس میں خود گمراہ ہوں مگر عربی میں مثال ہے مَنْ جَدَّ وَجَدَ۔ تو جس نے کوشش کی اس نے مقصود پا لیا۔ ہمارا کام دل سے کوشش کرنا ہے خداوند اسکی مزید توفیق عطا فرمائے آمین

تمہاری تائیوں اور چچی سے دعا۔ چھوٹی بہنیں سلام عرض کرتی ہیں۔ ظہور بھی سلام عرض کرتا ہے۔ زیادہ والسلام فقط احقر العباد الفقیر

عید مبارک!

Chapter 86 - That which appeareth at night.

Revealed at Mecca. Contains 17 or 18 verses.

In the name of the Most Gracious God.

1- By the heaven and that which appeareth at night;-
2- And what dost thou know (O Mohammed) what is that which appeareth at night,
3- (It is) a brilliant star;-
4- That there is not a single soul on which Our (angels as) guardians are not appointed.
5- So let man observe what he hath been created from.
6- He is created from a drop of water which spurteth out,
7- It cometh out from between the back & chest- bones.
8- Certainly God is powerful (enough) for recreating man (after his death).
9- The day when (men's) secrets shall be sifted out,
10- And he shall have no power (himself), nor a helper (for him).
11- By the heaven which poureth rain,
12- By the earth which splitteth (when seeds germinate),
13- That the Koran is a decisive discourse,
14- And it is not superficial (but it is deep & real).
15- Indeed these (infidels) are carrying out their own devices,
16- And I am working My plans (to frustrate them).
17- So, give the infidels time (O Mohammed) and be not in hurry for them (to be punished; just) give them a little time.

حاجی محمد اسد کا مکتوب

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو حاجی محمد اسد کو لاہور میں محکمۂ اسلامی تعمیرِ نو کا ناظم مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انہیں وزارتِ خارجہ میں مشرقِ وسطیٰ کے امورِ اسلامیہ کا مہتمم متعین کیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں انہیں اقوامِ متحدہ کے لئے پاکستانی وفد کا رکن نامزد کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب مغفور سے حاجی محمد اسد کا گہرا دوستانہ تعلق رہا۔ اسی بنا پر راقم نے ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے کچھ معلومات اخذ کرنے کی غرض سے انہیں ایک خط لکھا جس کا اصل متن اور ترجمہ درج ذیل ہے:

ترجمہ:-

پتہ:- کاسا کارا ویلا، کیری گو ٹیرا (ریلاس)

۲۷۴۵ کو ٹیلز، پرتگال۔

تاریخ:- ۱۴/ اگست ۱۹۸۶ء

عزیزم عبد القدیر

السلام علیکم!

مولانا نجف علی خان کے پوتے سے خط موصول کر کے مجھے بہت حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ میں آپ کی طرف سے پوچھے گئے تمام سوالات کا ایک ایک کر کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۱) میں آسٹریا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں گویا آج سے صحیح ۶۰ سال قبل میں نے اسلام قبول کیا۔

(۲) میں کسی بھی ملک سے بشمول آسٹریا کبھی نہیں نکالا گیا۔

(۳) میں ڈاکٹر عبد الغنی سے پہلی بار ۱۹۲۷ء میں مکہ معظمہ میں ملا ظاہر بات یہ ہے کہ میں اس سے قبل ہی مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا ورنہ میں

اس وقت مکہ میں نہ ہوتا ۔ ہم دونوں پہلی ہی ملاقات پر بہت دوست ہو گئے

(۴) یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر عبدالغنی سعودی عرب سے اسی بحری جہاز میں سفر کر کے ہندوستان آئے جس میں میں آیا ۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ جلالپور جٹاں میں ٹھہرا مگر میں مستقلاً وہاں کبھی نہیں رہا ۔ اس میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس سے کئی برس پہلے ہی افغانستان کو چھوڑ چکے تھے اور سعودی عرب میں ہماری ملاقات سے تو بہت پہلے چھوڑ چکے تھے ۔

(۵) اس وقت کی برطانوی ہند کی حکومت مجھے زیادہ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی تھی کیونکہ میں ایک یورپین مرتد تھا جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اور کم و بیش متواتر مجھ پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی مگر انہوں نے مجھے کسی طرح زیادہ تنگ کبھی نہیں کیا ۔ سوائے اس وقت جبکہ جنگ عظیم دوم چھڑ گئی ۔ اسوقت میرے پاس ۶ برس ملکہ زیادہ عرصے تک آسٹریا کا پاسپورٹ رہنے کی بنا پر برطانوی ہند کی حکومت نے مجھے ایک غیر ملکی دشمن سمجھتے ہوئے نظر بند کر دیا ۔

(۶) میں ڈاکٹر صاحب سے کبھی جدا نہیں ہوا ، یہاں تک کہ جب میں لاہور میں مکین ہو گیا تو ہم اکثر آپس میں ملاقات کرتے رہتے تھے ۔ آپ کے دادا مولانا صاحب سے بھی میل جول رہتا تھا ۔ ان دنوں میں وہاں محکمۂ اسلامی تعمیر نو کا ڈائرکٹر تھا ۔ اس محکمے کا مدعا پاکستان کی نو ساخت شدہ ریاست کے نظریاتی اصولوں کی توضیح کرنا تھا ۔

(۷) اسمیں شک نہیں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی دانائی اور تجربے سے بہت استفادہ کیا مگر میں نے اپنا اسلامی علم اُن سے اخذ نہیں کیا ۔ دراصل میں نے

اس سے پہلے ہی مدینہ منورہ کے چند سالہ قیام کے دوران اسلامیات کا کافی مطالعہ کر لیا تھا۔ میرے ان جملوں سے آپ پر اب بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ ہندوستان کو آنے سے بیشتر اسلام کی روشنی میں حل مسائل پہ عبور مجھے کیسے حاصل ہو سکا۔ اس سے اس امر کی بھی توضیح ہو جاتی ہے کہ صحیح بخاری اور پھر اسکے چند سال بعد قرآن حکیم کا ترجمہ بعنوان "پیغامِ قرآن" جو ۱۹۸۰ء میں چھپا لکھ سکنے کے اہل میں کس طرح ہوا جہاں تک عربی زبان پر میری دسترس کا تعلق ہے۔ تو یہ سعودی عرب کے شاہی خاندان سے برسوں قریبی مراسم رہنے کے سبب سے ممکن ہو سکا بلکہ اس ملک کے بدوؤں سے جو آج تک دنیا کی بہترین عربی بولتے آتے ہیں، رابطہ رہنے کی سبب ایسا ہو سکا۔ اس معاملے میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔

(۸) برطانوی ہند کی حکومت نے مجھے کبھی کسی عہدے کی پیشکش نہیں کی اور اگر کوئی ایسی پیش کش کی بھی جاتی تو میں اُسے قبول نہ کرتا۔ محکمۂ اسلامی تعمیر تو جیسا کہ اوپر بتا چکا ہوں بلاشک پاکستان کی حکومت کا ایک ادارہ تھا جسے میں نے قائم کیا تھا۔

(۹) میں نے پاکستان کو کبھی نہیں چھوڑا۔ میں آج تک ایک پاکستانی شہری ہوں اور میرے پاس پاکستانی پاسپورٹ ہے۔ لیکن میں بہت سالوں تک بیرونی ممالک میں رہا ہوں اور میں نے زیادہ تر مراکش میں قیام کیا ہے۔ لیکن اس دوران میں نے کئی بار پاکستان کا دورہ کیا ہے پاکستان کا تازہ ترین دورہ میں نے تین سال پہلے صدر ضیاء الحق کی دعوت پر کیا تھا جنکی بابت میں یہ سبیل تذکرہ بتا دوں کہ ان کی شخصیت نے مجھ پر بہت اعلیٰ تاثر چھوڑا۔

(۱۰) میں نے ۱۹۵۰ء میں پہلی بار اس وقت پاکستان چھوڑا جب

میں پاکستانی وزارتِ امورِ خارجہ کی مشرقِ وسطیٰ ڈویژن کا انچارج تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ۱۹۵۱ء میں اقوامِ متحدہ کے لئے پاکستانی وفد کا ایک وزیر مقرر کیا گیا اور ۱۹۵۵ء تک میں نیویارک میں رہا۔

اس مدت کے دوران میں نے وزارت خارجہ سے مستعفی ہو کر اپنی کتاب 'ROAD TO MECCA' 'مکہ معظمہ کو جانے والی شاہراہ' لکھی۔ تب سے میں اسلامی موضوعات پر لکھ رہا ہوں اور اب تک میں متعدد کتب لکھ چکا ہوں، ان میں سے 'THE MESSAGE OF THE QURAN'

(پیغام قرآن مجید) ایک ہے۔

(۱۱) جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں میں ۳ سال قبل پاکستان کو آیا تھا صدرِ پاکستان اور چند دوسری شخصیتوں سے ملاقات کرنے کے علاوہ میں اسلام آباد اور لاہور میں بہت سے احباب کو بھی ملا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی میں نے خطاب کیا مگر اب میں کسی حیثیت سے پاکستان کی کسی قسم کی نمائندگی نہیں کر رہا ہوں سوائے اس کے کہ اشاعتِ اسلام کے لئے اور پاکستان کی بہتری کے لئے اور مسلم امہ کے بہبود کے لئے میں ایک عام کارکن کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ میں نے گذشتہ برسوں میں کئی بار سعودی عرب کا دورہ کیا ہے اور وہاں نہ فقط شاہی خاندان سے اپنا ربط رکھا ہے بلکہ بہت سے پرانے اور نئے دوستوں کے ساتھ واسطہ قائم رکھا ہے۔ میں سعودی عرب کو پاکستان کے ساتھ ملاتے ہوئے دونوں کو اپنا روحانی گھر سمجھتا ہوں۔

(۱۲) ہاں میرا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام طلال ہے یہ میری عرب بیوی منیرہ کا فرزند ہے جو اب وفات پا چکی ہے یہ لڑکا آج کل انگلستان کی ہل یونیورسٹی میں سوشل انتھراپالوجی کا ایک سینئر لیکچرر ہے اسکی بیوی ایک انگریزی خاتون ہے اور وہ بھی انتھراپالوجسٹ ہے۔

۱۳) میں خط کو ختم کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مرحوم ڈاکٹر عبدالغنی کے ساتھ میری دوستی بڑی محکم تھی اور مجھے ان سے بڑی محبت تھی۔ وہ ایک ایسی ارفع شخصیت تھے جنہوں نے اپنے حین حیات بڑے دکھ اٹھائے مگر ان کا مضبوط ایمان کبھی متزلزل نہ ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ جنت میں جائینگے ڈاکٹر عبدالغنی ضرور انمیں سے ایک ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ ان کی روح پر اپنی رحمتوں کی بارش کرتا رہے۔

یہ ہے وہ سب کچھ جو اس وقت میرے ذہن میں آسکا ہے۔ عنقریب میں اور میری بیگم غالباً اکتوبر یا نومبر میں ماربلا (مغربی سپین) کو چلے جائینگے جہاں ہمارا ایڈریس یہ ہوگا۔

- -

- -

جب آپ ڈاکٹر صاحب پر اپنا مجوزہ کتابچہ تحریر کر چکیں تو براہ مہربانی اس کا ایک نسخہ مجھے سپین والے پتے پر ارسال کر دیا۔ اس اثناء میں مولانا نجف علی خان مرحوم کی اولاد کے حق میں مخلصانہ دعاگو رہوں گا۔

آپ کا

محمد اسد

REGISTERED

Casa Caravela
Carrasqueira (Belas)
2745 QUELUZ
Portugal

August 24, 1986

Mr. A. Q. Najafi
Mustafa Quarters
Jander Street
Nanthia Jadeed
PESHAWAR CANTONMENT
Pakistan

My dear Abdul Qadeer Najafi, السلام علیکم

It gave me a surprise and great pleasure to hear from the grandson of Maulana Najafi Ali Khan. I will try to answer all your questions one by one:

1) I was born into a Jewish family in Austria and accepted Islam in 1926 at the age of 26 - that is, exactly 60 years ago.

2) I have never been "ousted" from any country, including my native country, Austria.

3) I first met Dr. Abdul Ghani in Mecca in 1927. Of course I was already a Muslim at that time, otherwise I would not have been in Mecca. From the very first meeting we became close friends.

4) By sheer coincidence, I believe, Dr. Abdul Ghani travelled to India on the same ship with me in 1932. During the years which I spent in India, I stayed off and on with Dr. Abdul Ghani at Jalalpur Jattan, but never resided there permanently. Of course, he had left Afghanistan years before that and years before our meeting in Arabia.

5) The then-British Government in India did not like me very much because I was a European convert to Islam and all my friends were fellow-Muslims, and I was under more or less constant observation. But they did not persecute me in any way, except when the Second World War broke out and I was interned as an "enemy alien" because of my Austrian passport for over 6 years.

6) I have never been "separated" from Dr. Abdul Ghani. Even after I settled in Lahore we were very often meeting each other there, together with your grandfather. At that time I was Director of the Department of Islamic Reconstruction which was meant to elucidate the ideological principles underlying the new State of Pakistan.

7. Of course I benefited from Dr. Abdul Ghani's wisdom and experiences, but my Islamic knowledge was not derived from him. I had already studied Islamiat at Medina, where I lived for several years. This explains why I was so well-versed in Islamic problems before I came to India and it explains, also, how I was able to translate "Sahih al-Bukhari" and, subsequently, many years later, the Holy Qur'an, which appeared in 1980 under the title "The Message of the Qur'an". As for my command of Arabic, it was derived from

P.T.O.

شجرہ نسب
خاندان جنجوعہ
سکنہ لمبہوڑ ضلع گجرات
دریائے چناب
محمد غوث
غلام مرتضیٰ
شیخ راؤ (نو مسلم)
موضع لمبہوڑ نزد جلالپور جٹاں
تیار کردہ
رانا رشید احمد ولد رانا بشیر احمد
چیف ڈرافٹسمین (محکمہ بجلی (واپڈا)
سن ہجری ۴ رجب المرجب ۱۴۰۵
سن عیسوی ۲۶ مارچ ۱۹۸۵
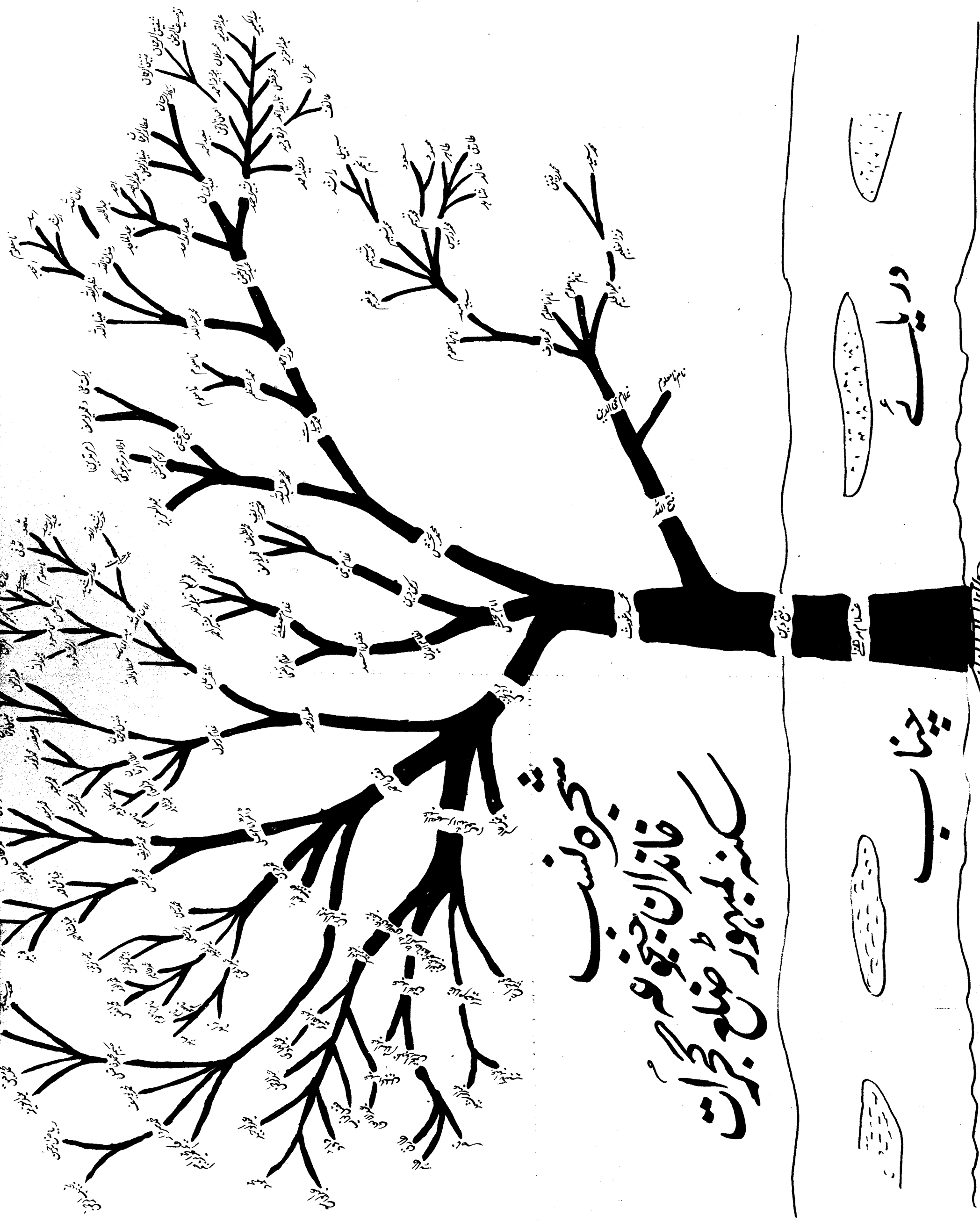
برطانوی ہند کی خفیہ پولیس :-

حاجی محمد اسد جیسے ڈاکٹر عبدالغنی کے دوستوں کے تاثرات تو آپ نے پڑھ لئے، اب آپ ان کے بارے میں ذرا حکومت برطانوی ہند کی خفیہ پولیس جیسے بداندیشیوں کے خیالات ملاحظہ کریں۔

. . . . . . ڈاکٹر عبدالغنی ایک خود بیں منافق تھا۔ وہ اپنے آپکو سنجیدہ اور کم گو ظاہر کرتا تھا۔ اس نے ایک مذہبی شخص ہونے کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مگر اس کی مذہبیت لچک سے عاری تھی۔

ایک زمانے میں وہ امیر عبدالرحمان خان کی بیوہ بی بی حلیمہ اور اس کے بیٹے عمر جان کا بہت منظورِ نظر رہا۔ وہ امیر حبیب اللہ خان کے ڈاکٹروں غلام نبی اور غلام محمد کے خلاف لگاتار سازشیں کرتا رہتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اسے امیر حبیب اللہ خان اور سردار عنایت اللہ خان کو قتل کرانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ اس کے کیس کو ۱۹۱۳ء میں اور پھر ۱۹۱۹ء میں از سرِ نو چھیڑا گیا۔ اسے ایک لمبے عرصے تک جیل میں رکھا گیا مگر اس کا سبب معلوم نہیں، ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر عبدالغنی کے متعلق اور دوسرے پروفیسروں کے متعلق جو اس کے ہمراہ گرفتار کئے گئے تھے۔ یہ بتایا گیا کہ شہزادہ امان اللہ خان کے ساتھ اور جیل کے باہر ان عناصر کے ساتھ جو حکومت سے غیر مطمئن تھے، ان کا رابطہ تھا۔ جنوری ۱۹۱۹ میں سنا گیا کہ ان کی حالت قدرے سدھر گئی ہے اور یہ کہ اپنی حالت میں یہ سدھار انہوں نے امان اللہ خان کے حکم و ہدایت پر کی ہے جو ان دنوں جیل خانہ جات کا معائنہ افسر تھا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر عبدالغنی کو معاہدہ امن راولپنڈی کے افغان وفد کا رکن نامزد کیا گیا۔ اس امن کانفرنس میں اس نے خلافِ برطانیہ پالیسی کی حمایت کی۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں اسے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بنایا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اسے اس عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اب وہ صرف مجلسِ شوریٰ کا ممبر

رہ گیا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں وہ ہندوستان کو واپس چلا آیا۔ اسے نادر خان کی طرف سے تاریخ افغانستان لکھنے کی دعوت دی گئی۔ اس کام کے لئے اسے نادر خان سے ایک ہزار روپے ملے۔ طے پایا کہ یہ تاریخ نادر خان کی تخت نشینی کے سال تک محدود رہے گی۔ ڈاکٹر غنی کو نادر خان کی بڑی قربت حاصل تھی۔ اس کے بھائی مولوی نجف علی کا افغانستان میں قیام جاری رہا مگر ۱۹۳۳ء میں اسے ملک سے چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے کچھ غیر منظور شدہ دینی کتب کے تراجم کئے تھے۔ آجکل یعنی ۱۹۳۵ء میں وہ ہندوستان میں ہے[1]۔

ترجمۂ رسالۂ دینیات۔

ڈاکٹر صاحب نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رسالۂ دینیات کا انگریزی میں ترجمہ بعنوان 'Towards understanding Islam' کیا جسے ترجمان القرآن پبلیکیشنز لاہور نے پہلی بار ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ اس ترجمے کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

" As the very name of the work indicates this small book is an attempt at a clear and coincise interpretation of Islam.... I, Abul Aala, owe a great debt of gratitude to Dr. Abdul Ghani, X-Director of Public Instructions, Afghanistan, who took pains in translating the Book from the origional in Urdu" (P-VI)

---

[1] Who's who in Afghanistan p 17-18

" Every religion of the world has been named after the founder or after the people among whom the religion had taken its birth...... Islam, however, claims the unique distinction of having no association with any particular person or people..... The object of the religion is to create in man the quality or attitude of Islam. (P-I)

Kufr literally means to cover or to conceal. The man who denies God is called Kafir (concealor) for he conceals by his disbelief what is inherent in his nature, for his nature is actually imbued with the instinct of Islam". (P-6)

یہاں قارئین پر یہ امر منکشف کر دیا جائے کہ 'مقالہ احوال و آثار' کے تخلیق کار عبدالجلیل نجفی کو ایک بار مرحوم مولانا مودودی سے مغفور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں انٹرویو لینے کا موقع ملا جس میں مولانا موصوف سے یہ انکشاف ہوا کہ انہیں اس وفد میں شامل ہونے کا اتّفاق ہوا جو برصغیر پاک و ہند کے مختلف اکناف سے جمع ہو کر ڈاکٹر صاحب کی قید سے رہائی پانے پر ان کا استقبال کرنے کی غرض سے پشاور پہنچا تھا۔ قارئین کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ مولانا مودودی ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب کی ولادت ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی رہائی کے وقت مولانا کی عمر ۱۶ برس یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس سے اس بات کی دلالت ہوتی ہے کہ 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کے مترادف

مولانا اتنی چھوٹی عمر میں ہی اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اتنے مقبول ہو چکے تھے کہ وہ چیدہ افراد کے اُس وفد میں شامل ہوسکیں جو ڈاکٹر صاحب جیسی عظیم شخصیت کے استقبال کے لئے تشکیل پایا تھا۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے عملی اور والہانہ وابستگی تھی اسی لئے انہوں نے مولانا مودودی جیسی اسلام دوست اور تفکّر فی الدین کرنے والی شخصیّتوں سے اپنا تعلّق قائم کیا۔ وہ برّصغیر کی مسلم تحریکوں مثلاً جماعت اسلامی، مسلم لیگ، احرار اور خاکسار وغیرہ سبھی کو گلہائے رنگارنگ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ان مختلف رنگوں اور مختلف خوشبوؤں والی تمام مسلم جماعتوں کی مساعی کا رُخ حصولِ حرّیت کی منزل کی طرف ہی تو ہے۔

ڈاکٹر عبد الغنی کی تصنیفات، تالیفات و تراجم

۱۔ اے ریویو آف دی پولٹیکل سیچوئیشن اِن سینٹرل ایشیا

(مطبوعہ) A Review of The Political Situation in Central Asia.

۲۔ اے بریف پولٹیکل ہسٹری آف افغانستان، ۴ جلد

(غیر مطبوعہ) A Brief Political History of Afghanistan

۳۔ مینز رول اِن لائف ـــــ دی گریٹیسٹ مین آف دی ورلڈ اِن پاسٹ پریذینٹ اینڈ فیوچر (غیر مطبوعہ)

Man's Role in Life — The Greatest Man of The world in Past, Present and Future (Peace be upon him)

۴۔ انگریزی ترجمۂ قرآن مجید (غیر مطبوعہ)

۵۔ انگریزی ترجمۂ رسالۂ دینیات (مطبوعہ)

۶۔ فریاد مینائے مسافر (غیر مطبوعہ)

۷۔ علم الید (غیر مطبوعہ)

فہرست ماخذات

۱۔ 'اے ریویو آف دی پولیٹیکل سچویشن اِن سنٹرل ایشیا'
از ڈاکٹر عبدالغنی

۲۔ 'اے بریف پولیٹیکل ہسٹری آف افغانستان'
از ڈاکٹر عبدالغنی

۳۔ تمثال 'فریاد مینائے مسافر' از ڈاکٹر عبدالغنی

۴۔ 'ٹورڈ انڈر سٹینڈنگ اسلام' (ترجمہ) از ڈاکٹر عبدالغنی

۵۔ 'قرآنِ مجید' (مخطوطہ) از ڈاکٹر عبدالغنی

۶۔ 'احوال و آثار مولانا نجف علی خان عاصی جلالپوری' از عبدالجلیل نجفی

۷۔ 'نالۂ درد' از مولانا نجف علی خان عاصی

۸۔ 'تحفۂ امانیہ' از مولانا نجف علی خان عاصی۔

۹۔ 'بیاضِ مولانا نجف علی خان عاصی'

۱۰۔ 'جنبشِ مشروطیت در افغانستان' از عبدالحیٔ حبیبی

۱۱۔ 'افغانستان در مسیرِ تاریخ' از میر غلام محمد غبار

۱۲۔ 'مقالہ' از میر قاسم

۱۳۔ 'انقلابِ افغانستان' از پروفیسر محمد حسین جالندھری۔

۱۴۔ 'زوالِ غازی امان اللہ خان' از عزیز ہندی

۱۵۔ مکتوب از علامہ حاجی محمد اسد

۱۶۔ 'نگاہے بہ عہدِ سلطنت امانی' از سید رسول

۱۷۔ 'افغان معاصر' از عبدالمنان بیرم

۱۸۔ 'منارِ علم و جہل'
۱۹۔ 'ویلکم ٹو کابل' از فضل احمد زرمتی
۲۰۔ 'کابل میں سات سال' از مولانا عبیداللہ سندھی
۲۱۔ 'مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت' از مولانا عبداللہ انصاری
۲۲۔ 'پیسہ اخبار' (۱۹۰۹ء)
۲۳۔ 'خطوط بنام عبدالرؤف' از ڈاکٹر عبدالغنی
۲۴۔ 'دی لائف آف امیر عبدالرحمٰن خان'
بحوالہ میر منشی سلطان محمد ہندوستانی
۲۵۔ 'تھرو امان اللہز افغانستان' از کے، ایچ کیٹرک
۲۶۔ 'فائر اِن افغانستان' از ری ٹیلی سٹوارٹ
۲۷۔ 'ریفارم اینڈ ری بیلیئن اِن افغانستان' از لیئن بی پولاڈا
۲۸۔ 'ایریا ہینڈ بک فار افغانستان'
۲۹۔ شجرۂ نسب خانوادۂ ڈاکٹر عبدالغنی
۳۰۔ بیانات مولوی محمد چراغ
۳۱۔ " حافظ عبدالمجید نجفی
۳۲۔ " والدۂ راقم الحروف
۳۳۔ " رانا ظہور الحق
۳۴۔ " میاں محمود علی قصوری
۳۵۔ " محمد اسلم

تاریخِ طباعت :
جون ۱۹۸۹ء بمطابق شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
خوشنویس :- قاری محمد عظیم

قیمت -/۵۰ روپے